قائداعظم: کیا تھے کیا نہیں تھے

قائداعظم: کیا تھے کیا نہیں تھے

ترتیب وتعارف:

ڈاکٹر مبارک علی

e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

نام کتاب : قائداعظم: کیا تھے کیا نہیں تھے

ترتیب وتعارف: ڈاکٹر مبارک علی

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**

بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض ظہور

اشاعت : 2012ء

قیمت : -/200 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 37237430-37249218-042

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 2780608-022

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

ڈاکٹر ایچ۔آر۔احمد

فہرست

تعارف

تاریخ اور شخصیت

تاریخ میں شخصیتوں کا کردار اہم ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتیں جو تاریخ میں تبدیلی لے کر آئیں، اور اس کے رخ کو موڑ دیں ہر معاشرہ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، مگر شخصیتیں، اپنا کردار ادا کر کے تاریخ کا ایک حصہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ معاشرے کہ جن میں نئے خیالات و افکار پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جو برابر آگے کی جانب بڑھتے ہیں، ان میں شخصیت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ وہ اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں اور روایات کو اس قدر مستحکم کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں شخصیت کا کردار کم سے کم ہو جاتا ہے۔ اگر اہم اور با اثر شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنا کردار ادا کر کے خاموش ہو جاتی ہیں۔ نئے رہنما آتے رہتے ہیں اور معاشرہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس پس ماندہ معاشرہ میں تخلیقی ذہن اور با اثر شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، اس لئے وہ کسی شخصیت کے سحر میں ایسے مبتلا ہوتے ہیں کہ اس کے خیالات افکار اور اس کے کردار کو لافانی بنا دیتے ہیں اور ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ جس میں اس کے خیالات اور شخصیت کے مقابلہ میں کوئی اور نہ ابھرے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ معاشرہ چاہے جس قدر پس ماندہ ہو وہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں رہتا ہے، ہر آنے والی نسل اپنے عزائم اور منصوبوں کو لے کر آتی ہے۔ اس صورت میں جب نئی شخصیت کی جگہ نہ ہو اور معاشرہ بھی اس قدر پس ماندہ ہو کہ وہ تخلیقی اور مثالی کردار کے افراد کو پیدا نہ کر سکے تو اس صورت میں ایک ہی شخصیت کو ہر آنے والی نسل اپنے خاکہ میں ڈھالتی رہتی ہے۔ اس طرح

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ جماعتوں، اور فرقوں کے مفادات میں اپنا روپ بدلتا رہتا ہے۔

ایک اور صورت یہ ہوتی ہے کہ شخصیت کے جانے کے بعد، حالات کے تحت معاشرے کی مختلف جماعتیں اور گروہ اس کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے منسوب ایسے خیالات کر دیتے ہیں کہ جن سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس طرح ایک ہی شخصیت کے مختلف روپ ابھرتے ہیں اور یوں اس کی تاریخی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

شخصیت پرستی کا ایک مظہر یہ ہے کہ جب معاشرہ میں دانش اور آگہی کی کمی ہو جائے اور ایسے افراد پیدا ہونے بند ہو جائیں کے جو نئے خیالات و افکار کو جنم دیں تو اس ذہنی پس ماندگی میں معاشرہ ایک ہی شخصیت کے خیالات کو اپناتا رہتا ہے۔ چاہے اس کے خیالات ماضی کا ہی حصہ کیوں نہ ہوں۔

پاکستان میں محمد علی جناح، قائداعظم کی شخصیت ایسی ہے کہ جس کی تاریخی حیثیت کو ختم کر کے جماعتوں، گروہوں اور افراد نے انہیں اپنے مفادات کے تحت، ان کی شخصیت اور خیالات کو بدل دیا ہے۔

جب کوئی شخصیت کسی جماعت یا گروہ کے نظریات سے متصادم ہو تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، یا تو اس کی شخصیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، یا اس سے بالکل انکار کر کے اس پر تنقید کی جاتی ہے، یا پھر اس کو اپنے خیالات کے تحت اپنے خاکے میں ڈھال لیا جاتا ہے تاکہ اس کی شخصیت کا جو اثر معاشرہ میں ہے، س سے انکار نہ کیا جائے بلکہ اسے استعمال کیا جائے۔

جناح صاحب کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ پاکستان کے مذہبی اور عقیدہ پرست حلقوں نے بجائے اس کے کہ ان پر تنقید کریں، ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے اور ان کے بارے میں ایسی فرضی باتیں اور قصے کہانیاں پھیلائی ہیں کہ ان کی اصلی شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور مسخ شدہ اور فرضی تصویر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔

جناح صاحب کی تاریخی شخصیت کو تبدیل کر کے انہیں مذہبی بنانے کی تحریک شروع ہو چکی ہے، اب انہیں صوم و صلوٰۃ کا پابند اور مذہبی ثابت کیا جا رہا ہے تاکہ اس بنیاد پر پاکستانی ریاست کو مذہبی بنایا جائے۔ ڈاکٹر صفدر محمود، جنہیں اخبارات میں کالم لکھنے کی آزادی ہے وہ مسلسل اس کام

میں مصروف ہیں، مثلاً ایک کہانی یہ بیان کی گئی کہ ایک دن مولانا حسرت موہانی ان سے ملنے گئے تو وہ ڈرائنگ روم میں نہیں تھے، اس لئے وہ ٹہلتے ہوئے ان کی خواب گاہ میں چلے گئے، اور دیکھا کہ جناح صاحب مصلے پر بیٹھے ہیں اور زاروقطار رو رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ اس سے زیادہ بے بنیاد اور لغو کہانی اور ہو نہیں سکتی۔ جناح صاحب اگر کسی کو ملنے کا وقت دیتے تھے تو وہ اس کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور کسی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اس طرح سے جناح صاحب کی خواب گاہ میں چلا جائے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اس قسم کی من گھڑت اور جھوٹی کہانیاں لکھ کر جناح صاحب کی شخصیت کو مسخ کر رہے ہیں۔

جناح صاحب کی شخصیت اور ان کے خیالات کے بارے میں ان کے دوستوں کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں۔ ان کے کردار کے بارے میں لوگوں کی گواہیاں بھی ہیں ان کی شخصیت بے داغ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل تھی۔ ایک وکیل کی حیثیت سے اور ایک سیاستدان کی شکل میں انہوں نے اعلیٰ کردار کی مثال قائم کی۔ انہوں نے بحیثیت وکیل کے دولت کمائی اور اسے انتہائی احتیاط سے خرچ کیا، اپنے رہن سہن، اور وضع قطع کے لحاظ سے وہ انگریز امراء کے طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے۔

سیاسی طور پر جمہوری اقدار کے حامی تھے۔ قانون اور دستور کی پابندی کرتے۔ مذہب کو نجی زندگی کا حصہ تسلیم کرتے تھے اور اسے سیاست میں استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن جب گاندھی جی ہندوستان آتے ہیں، اور سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو وہ مذہب کا استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت جناح صاحب کانگرس کے اہم لیڈران میں سے تھے۔ گاندھی جی نے آہستہ آہستہ انہیں ایک طرف کرنا شروع کیا اور پھر حالات جناح صاحب کو مسلم لیگ میں لے آئے، جو ان کے لئے ایک محدود طرز کی جماعت تھی۔

جیسا کہ اب نئی تحقیق سے ثابت ہو رہا ہے کہ وہ آخر وقت تک ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے، مگر حالات نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دیمک زدہ اور کھوکھلے پاکستان کو قبول کر لیں۔

1947ء کے بعد سے اب تک کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ ہم پاکستان کو کس جانب لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں جناح اور اقبال کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ خیالات و افکار اور نظریات کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوگا کہ پاکستانی

سیاست کو مذہبی طور پر غیر جانبدار بنا کر جمہوری اقدار کے تحت تشکیل دینا ہوگا یا پھر اس کو پرانی بنیادوں پر قائم رکھ کر سیاسی، معاشی اور سماجی انتشار میں مبتلا رکھنا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں حالات حاضرہ کو دیکھنا ہوگا، وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ہوگا، تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس لئے اس فیصلہ میں جناح صاحب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ مسئلہ معاشرہ کا اپنا ہوگا، جو اس کے مفاد میں ہوگا کہ مستقبل میں پاکستان کن بنیادوں پر قائم رہ کر دنیا کے چیلنجوں کا جواب دے سکے گا۔

جناح صاحب کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس کا مطالعہ ان کے حالات کے تناظر میں کرنا چاہئے، انہیں موجودہ حالات اور اس کے مسائل میں راہنما بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

جولائی 2012ء

قائداعظم کی شخصیت

ڈاکٹر مبارک علی

جناح صاحب کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں اور صفات تھیں کہ جن کی وجہ سے سیاستدانوں اور مورخوں کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ ان کے اردگرد افسانوں، کہانیوں اور افواہوں کا ایک ہالہ بنا کر انہیں ایک متھ بنا دیں اور انہیں ایک ایسی شخصیت میں تبدیل کر دیں کہ جس کا تعلق حقیقت سے نہ ہو۔ جناح صاحب کے کردار کے اہم پہلو یہ تھے کہ وہ خود تنہائی پسند تھے، کم بولتے تھے، اور اپنے نجی معاملات میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ذاتی تعلقات میں بھی دوری کا احساس رہتا تھا، شاید وہ کبھی کسی سے نہ تو بہت قریب ہوئے اور نہ ہی کسی کو اپنی زندگی کے رازوں میں شریک کیا۔ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اپنے اردگرد ایسی فضا قائم رکھنا چاہتے ہوں کہ جو ان کی شخصیت کو بارعب اور دبدبہ والی بنا دے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر سری پرکاش کے تاثرات قابل ذکر ہیں کہ جو انہوں نے اپنی کتاب ''پاکستان: قیام اور ابتدائی عہد'' میں لکھے ہیں۔ یہ اس استقبالیہ کا ذکر ہے کہ جو آزادی کے بعد پہلی مرتبہ سفارت کاروں کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ اس استقبالیہ میں مسلم لیگ کے راہنما اور اہم بیوروکریٹس بھی شامل تھے۔ سری پرکاش کا کہنا ہے کہ جناح صاحب دور ایک صوفہ پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے اور جن افراد سے انہیں ملنا ہوتا تھا، انہیں ایک ایک کر کے بلاتے تھے اور پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد اسے رخصت کر دیتے

تھے اس کو دیکھ کر ہائی کمشنر کا تاثر یہ تھا کہ جناح صاحب بہت اکیلے ہیں، اور ان میں تنہائی کا احساس اس شدت کے ساتھ ہے کہ وہ لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ وہ افراد بھی جو ان سے مل کر آتے تھے اور ان سے تھوڑی بہت بات چیت کرتے تھے، ان کے چہروں پر بھی سنجیدگی طاری تھی، جس سے اندازہ ہوا کہ ماحول میں شگفتگی اور زندگی کے بجائے خاموشی اور اداسی ہے۔

جناح صاحب کے کردار کی اس خصوصیت کی وجہ سے لوگوں میں یہ خیال تھا کہ ہر معاملہ میں ان کی رائے آخر ہوتی ہے۔ مسلم لیگ اور اس کے راہنما در حقیقت ربر اسٹمپ کی طرح ہیں کہ جو بلا کسی دلیل اور حجت کے ان کے فیصلہ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جناح صاحب کو مسلمانوں اور مسلم لیگ کا ''تنہا ترجمان'' (Sole Spokesman) کہا گیا۔

ویسے تو تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر عظیم آدمی کے بارے میں ایسی روایات تشکیل دیدی جاتی ہیں کہ جو اسے دوسروں سے افضل اور برتر بنا دے۔ جناح صاحب بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ ان کے عقیدت مندوں نے، اور بعض نے اپنے سیاسی و ذاتی مفادات کی غرض سے ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ان کی بیماری کے بارے میں ہے جسے دو فرانسیسی مصنفوں، لیری کولنس (Larry Collins) اور ڈومینیک لاپیر (Dominique Lappiere) اپنی کتاب ''فریڈم ایٹ مڈ نائٹ'' (آدھی رات میں آزادی) میں ڈرامائی انداز میں لکھا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ''اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو، اور مہاتما گاندھی اپریل 1947ء میں اس اہم راز سے واقف ہو جاتے، تو ہندوستان کی تقسیم کا عمل رک سکتا تھا۔ یہ راز بھورے رنگ کی ایک فلم کی سطح پر تھا، یہ وہ فلم تھی کہ جو ہندوستانی سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں، اتار چڑھاؤ اور ایشیا کی تاریخ کے عمل کو یقینی طور پر تبدیل کر سکتی تھی۔ لیکن یہ راز اس قدر قیمتی تھا،

اور اس کی اس قدر حفاظت کی گئی کہ برطانوی سی۔آئی۔ڈی جو کہ دنیا کی بہترین تحقیقاتی ایجنسی تھی، وہ بھی اس کے وجود سے بے خبر رہی۔"

یہ حوالہ جناح صاحب کے ان ایکسرے رپورٹس کے بارے میں ہے کہ جن میں ٹی۔بی کے مرض کی تشخیص کی گئی تھی۔اس پورے بیان کو ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کے بعد، مصنفوں نے مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"مرض اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مریض دو یا تین سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔ان ایکسریز کو ایک لفافہ میں بغیر کسی کا نام لکھے ڈاکٹر جے۔اے۔ایل۔پٹیل جو کہ بمبئی کا مشہور ڈاکٹر تھا اس کی تجوری میں مقفل کر دیا گیا۔"

اگر اس کہانی کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناح صاحب کی شخصیت وہ واحد شخصیت تھی کہ جس پر مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا دار و مدار تھا۔اگر وہ راستہ سے ہٹ جاتے تو پوری تحریک ختم ہو جاتی۔یہ کہانی اس وقت اور بھی دلچسپ رنگ اختیار کر لیتی ہے کہ جب اس میں ایک ہندو ڈاکٹر، ہندوستان کے اتحاد پر اس راز کو محفوظ رکھتا ہے اور اسے افشا نہیں کرتا ہے۔اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے نزدیک پروفیشنل اخلاقیات سیاسی تقاضوں سے زیادہ اہم تھی۔جناح صاحب کی بیماری کی یہ کہانی اس قدر مشہور ہوئی کہ اس نے بھی ان کی شخصیت کو اور زیادہ پُراسرار بنا دیا۔

1997ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر برطانوی مورخ پیٹرک فرنچ (Patrick French) نے ایک کتاب "آزادی یا موت" شائع کی۔اس کتاب کے لکھنے میں اس نے اس دستاویزات سے مدد لی کہ جو حال ہی میں حکومت برطانیہ نے اسکالرز کے لئے مہیا کیں۔مزید تحقیق کے لئے اس نے ہندوستان و پاکستان کا سفر کیا، لوگوں سے انٹرویوز کئے، اس کے نتیجہ میں اس نے جو تحقیق کی اس نے فرانسیسی مصنفوں کی بیان کردہ کہانی کو غلط ثابت کر دیا۔اس کا کہنا ہے کہ جہاں تک جناح

صاحب کی بیماری کا واقعہ ہے یہ کوئی راز نہیں تھا۔

1940ء کی دہائی میں پریس میں ان کے جو فوٹو چھپے ہیں، ان میں وہ بیمار نظر آ رہے ہیں۔ دوسرے مسلم لیگ کی تحریک کو ایک شخص کی ذات میں محدود کر دینا، اور یہ کہنا کہ صرف ان کی ذات سے پاکستان وجود میں آیا، یہ پاکستان کی تحریک اور تاریخ کو بہت ہی محدود اور تنگ دائرہ میں رہ کر دیکھنے والی بات ہے۔ اس نے مزید معنفوں کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مئی یا جون 1946ء میں بمبئی گئے ہی نہیں ہے، بلکہ اس وقت دہلی میں اور شملہ میں کرپس سے بات چیت میں مصروف تھے۔ اس کی تفتیش کے مطابق جے۔اے۔ایل۔پٹیل نامی کسی ڈاکٹر کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ 1946ء میں جناح صاحب تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، لیکن دستاویزات میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ جو اس تھیوری کو صحیح ثابت کرے۔

لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جناح صاحب نے کئی بار اس بات کا اظہار کیا کہ پاکستان کو وجود میں لانے والی ان کی واحد ذات ہے کہ جس کی وجہ سے نئی ریاست کا قیام ممکن ہوا۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی بار یہ کہا کہ ''پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے۔'' اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ وہ مسلم لیگ کے راہنماؤں سے خوش نہیں تھے، ان کے نزدیک وہ سب کے سب نااہل تھے، اور اس قابل نہیں تھے کہ ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ جناح صاحب نے اپنی بیماری کے پیش نظر یہ درست سمجھا ہو کہ ''دیک زدہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پاکستان'' کو حاصل کر لیا جائے۔ یہ بات آگے چل کر درست بھی ثابت ہوئی، کیونکہ ان کی وفات کے بعد یہ سیاسی راہنما ملک کے مسائل کو حل کرنے میں بری طرح سے ناکام ہو گئے۔ ان راہنماؤں کی ناکامی نے جناح صاحب کی شخصیت کو اور زیادہ ابھارا، اور عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ اگر جناح صاحب اور زیادہ عرصہ زندہ رہتے تھے تو پاکستان ان حالات و مصائب سے دوچار

نہیں ہوتا کہ جوان کی وفات کے بعد ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نے تو انہیں اس لئے عزت و احترام سے یاد رکھا کہ انہوں نے ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا، مگر حکمراں طبقوں نے اپنی نااہلی اور بدعنوانی کو چھپانے کے لئے ان کے نام کو استعمال کیا، اور اس وقت یہ حال ہے کہ یونیورسٹیوں، کالجوں، ہسپتالوں اور شاہراہوں کے نام ان پر رکھے گئے ہیں۔ پاکستانی شہری کسی شہر میں جائے، شہر کے کسی حصہ میں جائے، وہاں اسے جناح صاحب کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ نصاب کی کتابوں میں انہیں بطور ''قائداعظم'' پیش کیا جاتا ہے تاکہ نوجوان نسل ان کے کارناموں سے واقف ہو۔ اس ملک کے دانشوروں اور اسکالرز کے لئے قائداعظم پر لکھنا ایک انڈسٹری بن گئی ہے، ان پر جو بھی لکھا جائے، ایسی کتابوں پر حکومت انعامات و اکرامات و خطابات دیتی ہے۔ یہ کتابیں سرکاری کتب خانوں میں ڈھیروں خریدی جاتی ہیں، جس سے پبلشر اور مصنف دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔

جب ہالی وڈ میں گاندھی پر فلم بنی تو اس کے جواب میں جناح صاحب پر بھی فلم بنائی گئی، جس پر بے تحاشا پیسہ خرچ ہوا، مگر جو کوئی عالمی شہرت حاصل نہیں کر سکی۔ اب ہر سال 25- دسمبر کو قائداعظم کی سالگرہ ایک رسم بن گئی ہے کہ جس دن اخبارات اپنے ایڈیشن نکالتے ہیں۔ سیاستداں بیانات دیتے ہیں، حکمراں عوام کو تلقین کرتے ہیں کہ قائد کے نقش پر چلیں، اس طرح قائداعظم حکمراں طبقوں کے لئے ایک علامت بن گئے ہیں کہ جن کے نام پر وہ حکومت کرتے ہیں اور عوام کا استحصال کرتے ہیں۔

اب قائداعظم کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور اہم ہوگئی ہے کہ اگر کوئی بھی یہ دعویٰ کرے کہ وہ ان سے ملا تھا، ان سے بات چیت کی تھی، یا ان کی تقریر سنی تھی، تو وہ فوراً تحریک پاکستان کا اہم کارکن بن جاتا ہے اور ساتھ ہی میں ''رفیق قائد'' کا خطاب پا کر معاشرہ میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیتا ہے۔ قائداعظم کے اس قرب سے ہمارے حکمرانوں نے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مثلاً ذوالفقار علی بھٹو نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ بحیثیت طالب علم

کے انہوں نے بھی قائداعظم کو ایک خط لکھا تھا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں ان کے کچھ خوشامدیوں نے تو جناح صاحب کی ڈائری بھی دریافت کرلی تھی، یہ وہی وقت تھا کہ جب جرمنی میں ہٹلر کی ڈائریاں دریافت ہوئی تھیں اور جو بعد میں جعلی ثابت ہوئیں۔ جناح صاحب کی ڈائری کا بھی اس کے بعد پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئی۔ نواز شریف نے قائداعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود کو ''قائد ثانی'' کا خطاب دیدیا۔ اسی قسم کی ایک مثال فرانس کی تاریخ میں ملتی ہے کہ جب نپولین سوم نے اپنی شخصیت کو بڑھانے کے لئے نپولین اول کو اپنا ماڈل بنایا، تو کارل مارکس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہیگل نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اہم واقعات اور شخصیات کسی دوسری شکل میں دوبارہ نئے ماحول اور حالات میں ابھر کر آتے ہیں۔ لیکن وہ ایک بات بھول گیا کہ پہلی بار یہ المیہ کی شکل میں آتے ہیں تو دوسری بار جعلی روپ میں۔

پاکستان میں جناح صاحب کی شخصیت ایک ایسی دانشوری اور فکر کی علامت بن گئی ہے کہ جس کی وجہ سے لوگوں میں یہ خیال ہے کہ پاکستان کا جو وژن انہوں نے دیکھا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ لیکن جب ان کے وژن کی بات آتی ہے تو یہیں سے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں کہ وہ آخر کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے؟ کیا اسے مذہبی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے، یا اسے ایک جمہوری اور سیکولر ملک بنانا چاہتے تھے!!!

قائداعظم سے منسوب غلط بیانات وحکایات

ڈاکٹر صفدر محمود

ہوسکتا ہے کہ دوسرے ترقی پذیر ممالک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو لیکن کم سے کم پاکستان میں ہر اہم واقعے میں سازش ڈھونڈنے (conspiracy theory) افسانہ طرازی اور اکثر اوقات مبالغہ آمیزی کا رجحان اس قدر مقبول عام ہے کہ سچائی کو مبالغے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر سنی سنائی باتوں یا ایک آدھ راوی کی بیان کردہ روایت کو بلا تحقیق قبول کر کے اسے اس قدر اچھال دیا جاتا ہے کہ قارئین ایک مخصوص تاثر یا رائے یا نقطہ نظر کا شکار ہو جاتے ہیں اور آزادانہ ذہن سے غور کرنے یا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس ضمن میں ہم نے بابائے قوم قائداعظمؒ کو بھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ ان کی زندگی، بیانات، بیماری اور آخری سفر حتیٰ کہ تجہیز و تکفین کے بارے میں کئی ایسی کہانیاں مشہور ہیں جو اول تو بے بنیاد ہیں یا بظاہر مشکوک ہیں لیکن وہ زبان زد عام ہیں اور اکثر لوگ انہیں بلا تحقیق بڑے وثوق سے بیان کرتے اور اپنے اپنے نتائج نکالتے ہیں۔

مثلاً عام طور پر قائداعظمؒ کے ایک بیان کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے کہ ''پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا'' ایک طویل عرصے سے مقررین اپنی تقاریر میں زور پیدا کرنے کے لئے اس فقرے کو بے دریغ بیان کر رہے ہیں اور مضمون نگار اکثر اوقات اس فقرے کا ذکر یوں کرتے ہیں جیسے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہو لیکن اس بیان کا ثبوت کیا ہے؟

راوی کون ہے؟ یا کس نے یہ فقرہ اپنے کانوں سے سنا ہے؟ اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کے عظیم کردار، تاریخی جدوجہد اور پُرخلوص قیادت کے پس منظر میں عوامی سطح پر اس بیان کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ اب تو نوبت بایں جا رسید کہ بعض معروف سکالر اور مؤرخین بھی اس فقرے کو بلا تحقیق سچ سمجھ کر اپنے مضامین میں استعمال کر رہے ہیں بلکہ ایک مخصوص مکتب فکر کے حضرات قائداعظمؒ کی عظمت گھٹانے اور ان کے بارے میں غلط تاثر پیدا کرنے کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب ان سے اس بیان کا حوالہ (Source) پوچھا جائے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے روزنامہ ڈان کا 25- دسمبر 2001ء کا سپلیمنٹ (Books & Authors) (کتابیں اور مصنفین) رکھا ہے جس میں معروف مؤرخ مبارک علی کا ایک مضمون بعنوان Jinnah: Making of a Myth شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جناب مبارک علی نے درج ذیل فقرے لکھے ہیں جنہیں غور سے پڑھئے اور ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

"However, Jinnah himself on many occasions expressed the view that he was the sole creator of Pakistan. In one of his famous qoutes, he said that he and hims typewriter made Pakistan. The statement disregarded the efforts of his colleagues and the other muslim league leaders in the Pakistan Movement. It also downgraded the people's participation in the struggle for a separate homeland.

ترجمہ: (جناح نے بہت سے مواقع پر کہا کہ میں پاکستان کا واحد خالق ہوں۔ ایک

مشہور بیان میں انہوں نے کہا کہ پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا۔ اس بیان سے نہ صرف ان کے رفقاء اور دوسرے مسلم لیگی لیڈران کی جدوجہد کی نفی ہوتی ہے بلکہ تحریک پاکستان میں عوام کے کردار اور شمولیت کی بھی ہتک ہوتی ہے)

میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو ڈان سے ایڈریس لے کر ڈاکٹر مبارک علی کو ای میل بھیجی کہ آپ نے اپنے مضمون میں قائداعظمؒ کے بیان کا حوالہ دیا ہے اور اس نے اپنے من پسند نتائج اخذ کئے ہیں براہ کرم مجھے اس بیان کا ثبوت دیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا بیان کہ میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے پاکستان بنایا، پاکستان کے قیام کے بعد ہی دیا جانا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد قائداعظمؒ آخری سانس تک نہ صرف مقبول ترین لیڈر اور بابائے قوم سمجھے جاتے تھے بلکہ گورنر جنرل بھی تھے اور اس پس منظر میں ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر فقرہ چھپا ہوا ہے۔ محققین نے ان کے بیانات، تقریریں، انٹرویوز اور تحریریں بڑی محنت سے اکٹھی کر کے کتابی صورت میں شائع کر دی ہیں۔ میں نے اپنے طور پر قائداعظمؒ کی تقریروں کو غور سے پڑھا ہے اور مجھے ان کی تقاریر سے ایک فقرہ تو کیا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملا جس سے ان کے رفقاء یا عوام کی جدوجہد پر حرف آتا ہو۔ میں نے ڈاکٹر مبارک علی کو لکھا کہ وہ جتنا چاہیں وقت لیں لیکن مجھے اس بیان کا ثبوت دے دیں۔ میں ممنون ہوں گا۔ ایک عرصے کے بعد ان کا جواب آیا کہ اس کا تحریری ثبوت تو نہیں مل سکا البتہ میں نے یہ بات ممتاز مسلم لیگی لیڈر سعید احمد کرمانی صاحب سے سنی ہے۔ چنانچہ میں کرمانی صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اس ضمن میں ان سے دریافت کیا کہ کیا انہوں نے یا ان کے کسی ساتھی بزرگ نے کبھی یہ فقرہ قائداعظمؒ سے سنا یا کہیں پڑھا ہے یا کسی معتبر ذریعے سے یہ بیان ان تک پہنچا ہے۔ ان کا جواب مکمل نفی میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ قائداعظمؒ کے اس بیان کا کوئی ثبوت نہیں اور میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ قائداعظمؒ نے کبھی ایسی بات نہیں کی تاہم ہم سیاسی لیڈران اپنی تقاریر میں زور پیدا کرنے کے لئے اور قائداعظمؒ کے عظیم ترین رول کو

اجاگر کرنے کے لئے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ میں نے محترم کرمانی صاحب سے اپنی گفتگو بذریعہ ای میل ڈاکٹر مبارک علی کو لکھ دی اور پھر انہوں نے چپ سادھ لی۔ افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے معروف محققین بھی قائداعظمؒ جیسے رہنما کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھ جاتے ہیں اور پھر ایسے بیانات کو قائداعظمؒ کی وفات پر کیچڑ اچھالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں حالانکہ انہیں اپنی تحقیقی صلاحیتوں پر ناز ہے لیکن وہ قائداعظمؒ کے بارے میں فتویٰ دینے سے پہلے ان کے بیانات کی تصدیق کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

13- اگست 2003ء کو تحریک پاکستان کے ضمن میں قائداعظم لائبریری لاہور کے ہال میں ایک جلسہ ہوا جہاں مقررین میں، میں بھی شریک تھا۔ اس جلسے میں لاہور کی ایک معروف لکھاری خاتون پروفیسر نے اپنی تقریر میں یہ انکشاف کیا کہ جن دنوں قائداعظمؒ زیارت میں شدید علیل تھے، ان سے ملنے کے لئے ایک مسلم لیگی وفد وہاں پہنچا جس سے گفتگو کے دوران قائداعظمؒ نے اپنے سرہانے رکھے ٹائپ رائٹر کی جانب اشارہ کیا اور کہا کہ پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا۔ ایک ذمہ دار پروفیسر نے جس افسانوی انداز میں یہ واقعہ بیان کیا، اس سے میں حیران و پریشان ہوگیا۔ چنانچہ میں نے اسی شام قائداعظمؒ کے اے ڈی سی جناب بریگیڈئر ریٹائرڈ نور حسین صاحب سے رابطہ کیا اور ان سے اس واقعے کی تصدیق چاہی کیونکہ قائداعظم کے آخری ایام کے واحد عینی شاہد محترم نور حسین صاحب ہیں جو طویل عرصے تک ان کے اے ڈی سی رہے اور زیارت میں ہمہ وقت ان کے پاس موجود رہے۔ بریگیڈئر نور حسین جو اس وقت کیپٹن نور حسین تھے، نے مجھے بتایا کہ میں تمام ملاقاتوں میں قائداعظم کے پاس ہی موجود رہتا تھا ماسوا ایک دو ایسی ملاقاتوں کے جہاں قائداعظم کسی سے تنہائی میں ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا.........

اول تو علالت کے سبب عام وفود کی ملاقاتوں پر پابندی تھی۔ دوم ان کے سرہانے ہرگز

کوئی ٹائپ رائٹر موجود نہیں تھا۔ سوم قائداعظمؒ نے کبھی ایسی بات نہیں کہی بلکہ ایسا فقرہ تک بھی کبھی نہیں کہا جس سے اس تاثر کا شائبہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس بریگیڈئر صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک موقعہ پر میرے ایک ساتھی نے قائداعظمؒ سے یہ کہا کہ ''قائداعظم آپ نے پاکستان بنایا ہے'' تو قائداعظم نے فوراً وضاحت کی کہ ''نہیں، پاکستان مسلم لیگ اور عوام نے بنایا ہے'' لیکن ہماری قابل احترام پروفیسر صاحبہ اس اعتماد سے یہ واقعہ بیان کر گئیں جیسے وہ خود موقعہ پر موجود تھیں۔

اس طرح ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں قائداعظمؒ کو رگیدنے کے لئے یہ فتویٰ بھی دے دیا ہے کہ خود قائداعظمؒ نے کئی بار یہ دعویٰ کیا کہ پاکستان تنہا انہوں نے بنایا جبکہ قائداعظمؒ کی بحیثیت گورنر جنرل تقاریر اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے ضمن میں ہمیشہ لفظ ہم (We) استعمال کیا کہ ہم نے مل کر پاکستان بنایا ہے، کبھی کسی موقع پر انہوں نے لفظ ''میں'' (I) استعمال نہیں کیا۔ وہ اپنی تقاریر میں نہ صرف عوام کی قربانیوں کی تعریف کرتے رہے بلکہ ان کے دکھ، فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے قتل عام اور مصائب پر بھی دلی غم کا اظہار کرتے رہے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا وفد ملنے گیا ہو یا مسلم لیگی اراکین کا، انہوں نے ہمیشہ ان کی قربانیوں اور حصول پاکستان میں ان کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔ رائٹر کے نمائندے ڈنکن ہوپر کو 25-اکتوبر 1947ء کو دیئے گئے انٹرویو میں بھی انہوں نے کہا:

The Muslim League has already achieved its mission which was to establish the independent state of Pakistan.

(ترجمہ: مسلم لیگ پاکستان قائم کر کے اپنی منزل حاصل کر چکی ہے) گویا انہوں نے حصول پاکستان کا کریڈٹ مسلم لیگ کو دیا۔

مختصر یہ کہ قائداعظمؒ سے کئی بے بنیاد بیانات منسوب کر کے ہم نہ صرف جھوٹ بول

رہے ہیں اوران کے بارے میں غلط تاثر پیدا کررہے ہیں بلکہ نوجوان نسل کو بھی گمراہ کررہے ہیں۔اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی قائداعظمؒ سے منسوب یہ فقرہ بھی ہے کہ ''میری جیب میں کھوٹے سکے ڈال دیئے گئے ہیں'' ڈاکٹر مبارک علی نے بھی اپنے مضمون میں اس بیان کا ذکر کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی، بلاشبہ مسلم لیگ کی قیادت میں وڈیروں، خودغرض اور ابن الوقت لیڈروں کی بہتات تھی اور قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ نے یہ ثابت کردیا کہ قائداعظم کے ساتھیوں کی اکثریت کھوٹے سکے ہی تھی لیکن خود قائداعظمؒ نے ایسا کبھی نہیں کہا۔قائداعظم کو کھوٹے سکوں کے علاوہ انتہائی مخلص، بے لوث اور قابل ساتھی بھی ملے تھے جن کی وہ دل سے عزت کرتے تھے۔پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر ضیاء الاسلام، جو آج کل کارکنان تحریک پاکستان ٹرسٹ کے رکن ہیں، نے یہ واقعہ مجھے کئی بار بتایا کہ جب قیام پاکستان کے چند ماہ بعد وہ طالب علموں کے ایک وفد کے ساتھ قائداعظم سے ملنے گئے تو انہوں نے زور دے کر کہا کہ پاکستان، وڈیروں اور رئیس زمینداروں نے نہیں بلکہ عوام اور مسلم لیگ نے بنایا ہے اور تم آگے بڑھو اور ملک کی قیادت سنبھالو۔ڈاکٹر ضیاء الاسلام کے بقول قائداعظمؒ نے نہ کبھی قیام پاکستان کا کریڈٹ خود لیا اور نہ ہی اپنے ساتھیوں کو کبھی کھوٹے سکے کہا لیکن افسوس یہ ہے کہ گزشتہ پچپن برسوں میں قائداعظمؒ سے منسوب کر کے یہ بیانات اس قدر دہرائے گئے ہیں کہ اب کوئی ان کی حقیقت کو چیلنج ہی نہیں کرتا۔سچ ہے کہ باربار بولا جانے والا جھوٹ آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں میں جگہ بنالیتا ہے۔یہ پراپیگنڈے کا کمال ہے۔

روزنامہ نوائے وقت 25-دسمبر 2003ء

قائداعظم سے متعلق صفدر محمود کو جواب

ڈاکٹر مبارک علی

25- دسمبر کو صفدر محمود نے قائداعظم پر مختلف اخباروں میں جو مضمون شائع کرایا ہے، اس میں انہوں نے میرے ایک مضمون کے حوالے سے جو محمد علی جناح پر روزنامہ ڈان میں 25- دسمبر 2001ء میں شائع ہوا تھا تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے اس میں قائداعظم کے حوالہ سے یہ کہا ہے کہ "پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے"۔ ان کے نزدیک یہ فقرہ کسی حوالے سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مجھ سے ضرور رابطہ کیا تھا، میرا خیال تھا کہ صفدر محمود صاحب نے پاکستان کی تحریک پر بہت کچھ لکھا ہے، اس لئے انہیں اس جملے کے حوالوں کا بھی علم ہوگا۔ اس سلسلہ میں، میں نے احمد سعید کرمانی صاحب کا ذکر کیا تھا کہ وہ اس کی تصدیق کریں گے۔ مگر ان کے بیانات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے قائداعظم اور ان کی سوانح حیات پر گہرائی سے نہیں پڑھا اور نہ وہ ان کے مزاج اور عادات کو پوری طرح سے سمجھ سکے۔ اسی وجہ سے یہ فقرہ ان کے لئے باعث تشویش بن گیا۔ مثلاً اس وقت میرے سامنے دو کتابیں ہیں، جن میں یہ حوالہ موجود ہے، ایک کتاب، اسکندر مرزا پر ہے جس کا ٹائٹل ہے، :Iskander Mirza Rise and Fall of a President اس کے مصنف احمد سلیم ہیں، یہ لاہور سے 1997ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے تیرہویں باب میں اسکندر مرزا کی یادداشتوں کے

حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب وہ تقسیم کے فوراً بعد قائداعظم، گورنر جنرل آف پاکستان سے ملنے گئے تو دوران گفتگو میں انہوں نے قائداعظم سے کہا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"I said in the course of conversation, that we must try to be considerate to the Muslim Leaguers, after all they had struggled for the creation of Pakistan".

(دوران گفتگو میں نے کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مسلم لیگیوں کا خیال رکھیں کیونکہ انہوں نے پاکستان کی تخلیق میں جدوجہد کی ہے۔)

اس پر جناح صاحب نے فوری طور پر کہا:

"Who told you that the Muslim League brought Pakistan into being. I did it alone, with my steno grapher".

(تم سے کس نے کہا کہ پاکستان کو بنانے میں مسلم لیگ کا حصہ ہے۔ یہ کام میں نے تنہا کیا ہے، اپنے اسٹینوگرافر کے ساتھ مل کر۔)

اسی بات کو مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب

The Sound of Fury: Political Study of M. A. Jinnah

میں صفحہ 347 پر دیا ہے۔ جناح صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"I have won Pakistan with the help of my Secretary and his Typewriter".

(میں نے پاکستان اپنے سیکریٹری اور اس کے ٹائپ رائٹر کی مدد سے حاصل کیا ہے۔)

مطلوب الحسن سید، قائداعظم کے ابتدائی سوانح نگاروں میں ہیں، ان کی کتاب کے کئی ایڈیشن پاکستان و ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرے سامنے 1981ء کا دہلی کا شائع

شدہ نسخہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قائداعظم نے اس بات کو کئی بار دہرایا ہے، اس لئے ان کی اس بات کا دوسرے سوانح نگاروں نے بھی ذکر کیا ہے، اگر صفدر محمود کوشش کرتے تو انہیں یہ حوالے بہ آسانی مل جاتے۔

دوسری بات جو قائداعظم نے کہی کہ ان کی جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ یہ بات انہوں نے راجہ صاحب آف محمود آباد سے کہی تھی جب وہ لندن جاتے ہوئے کراچی میں ان سے ملے تھے۔ اس کا حوالہ پاکستان کے ایک سابق سفیر افضل محمود نے ڈان میں شائع شدہ ایک آرٹیکل میں دیا تھا۔ ان سے یہ بات راجہ صاحب آف محمود آباد نے کہی تھی۔

تاریخ نویسی میں حقائق کو جانچنے کا ایک طریقہ کار یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق کسی شخصیت سے ہوتا ہے تو اس کے مزاج اور عادات کو دیکھا جاتا ہے اور پھر اس کی بات کو پرکھا جاتا ہے۔ قائداعظم کی شخصیت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ذاتی خود اعتمادی بہت تھی، اور وہ مسلم لیگ کے دوسرے راہنماؤں سے خوش نہ تھے۔ پاکستان کے سلسلہ میں انہوں نے جو مقدمہ تیار کیا تھا اس میں وہ تنہا شریک تھے۔ اس لئے یہ دونوں باتیں ان کی شخصیت اور مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔

قائداعظم نے مسلم لیگ کے راہنماؤں کے بارے میں جو کہا تھا، وہ آگے چل کر صحیح ثابت ہوا کیونکہ بعد کے حالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں ملک کو چلانے کی کوئی اہلیت نہیں تھی۔ 1951ء میں لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد تو ملک میں سیاسی سازشوں اور گٹھ جوڑ کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا تھا، یہاں تک کہ 1958ء میں مارشل لاء نے ملک کی سیاست کا رخ بدل دیا۔

جیسا کہ ہمارے معاشرے میں دستور ہے، قائداعظم کی زندگی ہی میں ان کی بری طرح سے خوشامد کی گئی۔ جب انہیں دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو لیاقت علی خان

نے کہا کہ یہ دستور ساز اسمبلی کے لئے عزت کی بات ہے کہ قائداعظم کو صدر بنایا گیا ہے، کیونکہ وہ پاکستان کے معمار ہیں کہ جنہوں نے خلوص و دیانت اور بے لوثی کے ساتھ اس ملک کو حاصل کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو انہیں شہنشاہ پاکستان کہنا شروع کر دیا تھا، اور کراچی میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور انہیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا تھا۔ (خالد بن سعید کی کتاب، پاکستان: دی فارمیٹیو فیز۔1848-1857)

اس بات کو قائداعظم کے سب ہی سوانح نگار تسلیم کرتے ہیں کہ وہ قطعی مذہبی نہیں تھے۔ لیکن پاکستان میں آہستہ آہستہ قائداعظم کو مذہبی شخص بنا کر انہیں ولی کا رتبہ دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اب سرکاری تصاویر میں وہ شیروانی اور جناح کیپ میں نظر آتے ہیں۔ سوٹ، ٹائی، یا سگار پیتے ہوئے نہیں۔ اب ان کے بارے میں یہ کہانیاں بنائی جا رہی ہیں کہ وہ عبادت گذار اور مذہب سے لگاؤ رکھنے والے تھے۔ صفدر محمود نے پچھلے سال جو مضمون لکھا اس میں یہ واقعہ نہ جانے کس حوالے سے لکھا ہے کہ حسرت موہانی ایک بار ان سے ملنے گئے، جب انہوں نے انہیں ڈرائنگ روم میں نہیں پایا تو وہ ٹہلتے ہوئے ان کی خواب گاہ میں چلے گئے اور دیکھا کہ قائداعظم عبادت میں مشغول ہیں۔ بلک بلک کر رو رہے ہیں اور قوم کی نجات کی دعا مانگ رہے ہیں۔

جس شخص نے قائداعظم کی سوانح پڑھی ہو، ان کے مزاج سے واقف ہو، وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کسی سے ملاقات کرتے تھے تو وقت کی پابندی کا خیال رکھتے تھے۔ دوسرے وہ انتہائی نجی آدمی تھے، اور کسی کو یہ جرات نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ان کی خواب گاہ میں جائے۔ چاہے وہ حسرت موہانی ہی کیوں نہ ہوں۔

اگر صفدر محمود صاحب اسی قسم کی تاریخ تشکیل دے کر اسے مسخ کرنا چاہتے ہیں، تو ضرور کریں، مگر ان کی یہ تشکیل شدہ تاریخ ریت کے گھروندے ہیں جو بہت جلد گر جائیں گے۔ جناح صاحب ایک سیکولر، جدید ذہن اور رواداری کے حامل تھے۔ وہ مذہب کو

سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ذات سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کو بھی سامنے لانا ضروری ہے، تا کہ وہ ایک انسان کی حیثیت میں ہمارے سامنے آئیں، نہ کہ مقدس شخصیت کے طور پر۔

پس ماندہ معاشروں کا یہ المیہ ہے کہ ان کے ہاں نظریات، افکار اور خیالات سے زیادہ شخصیتوں پر زور دیا جاتا ہے اور انہیں اس قدر مقدس اور متبرک بنالیا جاتا ہے کہ ان کا کہا ہوا ہر لفظ درست اور صحیح تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخصیت اس مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے نام سے منسوب کر کے، یا اس کے بیانات اور خیالات کو مسخ کر کے سیاستداں اور راہنما اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہی صورت پاکستان میں قائداعظم کی ہے کہ جنہیں دائیں اور بائیں بازو کے لوگ اپنے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اور دونوں ان کی تقریروں اور بیانات سے اپنے مطلب کی باتیں ڈھونڈ لاتے ہیں۔ جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شخصیت سے علیحدہ ہو کر نظریات و افکار کی بنیاد پر لوگوں کے ذہن کو بدلا جائے، کیونکہ شخصیت ایک عہد اور وقت کی پیداوار ہوتی ہے۔ جب کہ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نظریات و افکار بھی وقت کے تقاضوں کے تحت تشکیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی ایک شخصیت معاشرے کے ذہن و دماغ پر چھا جائے تو پھر نئے خیالات تخلیق نہیں ہوتے ہیں۔ معاشرہ محض تقلید کی راہ اختیار کرتا ہے۔ کیا ہم تاریخ کے اس عمل سے کچھ سیکھنے کے لئے تیار ہیں؟

قرض اور فرض

ڈاکٹر صفدر محمود

''قرض'' کا لفظ پڑھ کر آپ گھبرا نہ جائیں کیونکہ میں آپ کو سنسنی خیز داستانوں اور نام نہاد سازشوں کی تفصیلات سنانے نہیں جا رہا بلکہ وہ قرض اتارنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو قارئین کا مجھ پر واجب ہے۔ چنانچہ میں ایک آدھ واقعے کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں اور ایک زبان زد عام مقولے یا مشہور قول کا پس منظر واضح کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تا کہ قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔

پہلے قرض اور پھر فرض کی جانب آؤں گا۔ قرض یوں کہ میں نے اپنے ایک گزشتہ مضمون بعنوان ''تحریک پاکستان کے منفرد پہلو اور مشیت ایزدی کے واضح اشارے'' مطبوعہ 14-اگست 2003ء میں ایک واقعے کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق مولانا حسین احمد مدنی سے تھا۔ علاوہ ازیں میں نے مولانا اشرف تھانوی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا حسین احمد مدنی کے خوابوں کا ذکر تھا جس میں مولانا تھانوی اور مولانا موہانی کے خوابوں کے ضمن میں مصدقہ کتابوں کا حوالہ دیا گیا تھا لیکن مولانا حسین احمد مدنی کے حوالے سے میں نے لکھا تھا کہ یہ بات میں نے کمیٹی بزرگوں سے سنی ہے لیکن مجھے اس کا کوئی قابل اعتماد ریفرنس نہیں ملا۔ جن حضرات نے یہ مضمون پڑھا ہے ان کو یاد ہو گا کہ میں نے ان عظیم ہستیوں کے ان خوابوں کا ذکر کیا تھا جن میں قیام پاکستان کی بشارت دی گئی تھی اور یہ احوال مصدقہ کتب

میں موجود تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے بھی 1946ء میں ایک ایسا خواب دیکھا تھا جس میں ان کو قیام پاکستان کی بشارت دی گئی تھی۔ جب یہ مضمون چھپا تو مجھے عزیزم خواجہ محمد طارق ڈی ایم جی افسر نے فون کیا اور اس خواب کی تفصیل بیان کی چنانچہ میں نے ان سے اس کا ثبوت مانگا۔ مشکل یہ تھی کہ انہوں نے جس کتاب کا حوالہ دیا وہ آسانی سے پاکستان میں دستیاب نہیں تھی چنانچہ انہیں یہ کتاب حاصل کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگ گیا اور میں سند کے بغیر وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب چونکہ سند مل گئی ہے اس لئے میں اصل واقعہ من وعن پیش کر رہا ہوں اگرچہ مجھے احساس ہے کہ کئی حضرات اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور مجھ پر تبرا بھیجیں گے لیکن ریکارڈ کی تصحیح میرا فرض ہے اور یہ قارئین کا مجھ پر فرض ہے۔ اس وقت ایک کتاب میرے سامنے پڑی ہے جس کا نام ہے ''شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، واقعات وکرامات کی روشنی میں'' اس کتاب کے مرتب مولانا سید رشید الدین حمیدی ہیں اور یہ مراد آباد سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر 94 پر درج ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے ''اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا۔'' مولانا رشید احمد صدیقی کلکتہ نے اسے یوں بیان کیا ہے۔ 1946ء جنرل الیکشن کی ہنگامہ خیزیوں کا زمانہ تھا۔ حضرت مدنیؒ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ صوبہ بنگال میں تمام صوبوں کے بعد الیکشن ہونا تھا، اس لئے حضرت اواخر فروری میں نواکھالی تشریف لے گئے تھے۔ قافلہ میں مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا نافع گل اور دیگر چند پشاوری طالب علم تھے۔ 3-مارچ کو گوپال پور تھانہ بیگم گنج پہنچے۔ چوہدری رزاق الحیدر کے دولت کدہ پر قیام ہوا۔ دوسرے دن ایک عظیم الشان انتخابی جلسہ میں تقریر کا پروگرام تھا۔ رات میں گیارہ بجے کھانا تناول فرما کر 12 بجے کے قریب آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے۔ میں پاؤں دباتا رہا۔ کچھ دیر بعد نیند آ گئی۔ ہم لوگ دوسرے کمرے میں جا

کر کچھ ضروری کام کرنے لگے۔ تقریباً دو بجے رات میں مجھ کو اور چوہدری مصطفیٰ کو طلب فرمایا۔ ہم دونوں حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ لو بھئی! اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ دے دیا اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں کیا کریں گے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس کے لئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ دوسرے دن گوپال پور کے عظیم الشان جلسہ میں تقسیم پر معرکتہ الآ را تقریر فرمائی۔ بالآخر 3- جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے غیر متوقع اعلان سے اس واقعہ کی حرف بحرف تصدیق ہوگئی۔''

اسی کتاب کے صفحہ نمبر 136 پر مولانا افضال الحق اعظمی کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے جو قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ ''پاکستان بن جانے کے بعد ایک صاحب نے مجلس میں سوال کیا کہ حضرت پاکستان کے لئے اب آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت کے ساتھ فرمایا کہ مسجد جب تک نہ بنے، اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب بن گئی تو وہ مسجد ہے۔'' غور کیجئے پاکستان کے لئے مسجد کا لفظ استعمال کیا گیا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی مانند مولانا ابوالکلام نے بھی ڈٹ کر تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن میں نے کئی ایسے واقعات پڑھے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ان کے دل میں پاکستان کے لئے نرم گوشہ موجود تھا اور وہ پاکستان کے استحکام کے خواہاں تھے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس کے سرکردہ لیڈر اور قیام پاکستان کے زبردست مخالف تھے۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ اس روحانی واردات کا ذکر نہ کرتے کیونکہ اس سے ان کے سیاسی موقف پر زد پڑتی تھی اور ان کے پیروکاروں کے حوصلے پست ہوتے تھے۔ ان پر جو کچھ منکشف ہوا انہوں نے اپنے قریبی مریدان سے

بیان کر دیا۔اس طرح میں نے اپنے 14-اگست 2003ء والے مضمون میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسرت موہانی کے روحانی انکشافات کا ذکر کیا تھا جو میں نے مصدقہ کتابوں میں پڑھے تھے اوران کتابوں کا حوالہ بھی دیا تھا کیونکہ یہ کوئی سینہ بہ سینہ سفر کرنے والی داستانیں نہ تھیں بلکہ یہ ان کے قریبی اور عینی شاہدوں کے بیانات تھے جوان حضرات کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ان واقعات یا روحانی انکشافات کے بیان سے نہ کسی کا کوئی مطلب پورا ہوتا تھا اور نہ ہی ان کے پس پردہ کوئی مطلب براری یا محرک تھا اور پھر یہ واقعات ایسی ہستیوں کے بارے میں تھے جن کی عظمت کردار، نیکی، سچائی اور باطنی روشنی مسلمہ ہے لیکن چند ایک منکران روحانیت، مخالفین دین و مذہب اور ملحد قسم کے حضرات نے میرے مخالف محاذ کھول دیئے۔جس کی مجھے چنداں پروانہیں کیونکہ میں نے تحقیق کے نتیجہ کے طور پر جہاں تاریخ فرشتہ کے حوالے دیئے تھے اور محمد بن قاسم سے لے کر تقسیم ہند تک کے اہم واقعات یا سنگ ہائے میل کے رخ اور اہمیت کا ذکر کیا تھا وہاں روحانی پہلو کی طرف سے بھی مختصر سا اشارہ کیا تھا جن کی حمایت میں مستند حوالے موجود تھے۔ہندوستان سے کچھ ہندوؤں اور پاکستان سے اکھنڈ بھارت کے چند ایجنٹوں نے بھی گالیوں سے بھری ای میلیں بھجوائیں کیونکہ انہیں میرے مضمون میں روحانی پہلو اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناگوار گزرا تھا۔ان کا ردعمل قابل فہم تھا۔اسی طرح ہمارے چند ایک حضرات، جنہیں عقل کُل ہونے کا زعم ہے اور جو بظاہر آزادی اظہار کے علمبردار ہیں انہوں نے بھی ان واقعات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے جس طرح تمسخر اڑانے کی سعی کی اس سے بھی مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ میرے لئے یہ سب کچھ متوقع تھا اس لئے کہ

"اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کی باتوں میں"

جناب خالد احمد نے بھی اپنی قلمی توپ سے مجھ پر گولے برسائے اور ایک کالم لکھ مارا لیکن میں اس کا جواب دے کر اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ خالد صاحب گورنمنٹ

کالج لاہور میں میرے ہم عصر تھے، میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان تمام حضرات کے نقطہ نظر کا احترام کرتا ہوں جو علمی ادبی موقف کو ذاتی رنگ دے کر غیر مہذب سطح پر نہیں اترتے۔ اختلاف ایک مثبت سوچ اور صحت مند معاشرتی قدر ہے لیکن اس پر ذاتیات کا رنگ چڑھا کر منفی تنقید کرنا اور کسی کا تمسخر اڑانا ذہنی پستی کی علامت ہے جو کم از کم جمہوریت اور آزادی اظہار کے علمبرداروں کو زیب نہیں دیتی۔ جہاں تک سچے خواب یا کسی عظیم شخصیت کی روحانی واردات سے ناگواری کا تعلق ہے تو پنجابی کے ایک مصرع کے مطابق

گوری مجھے توں کی جانیں انارکلی دیاں شاناں

ترجمہ: (اے گوری بھینس تو انارکلی کی شان نہیں سمجھ سکتی)

اب دوسرے قرض کی طرف آتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ 25- دسمبر 2003ء کو میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''قائداعظمؒ سے منسوب غلط بیانات وشکایات''۔ اس مضمون میں، میں نے قائداعظمؒ سے منسوب ایک بیان کا ذکر کیا تھا جو قطعاً بے بنیاد ہے لیکن جسے قائداعظمؒ کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ قائداعظمؒ سے یہ فقرہ منسوب کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی لیکن افسوس کہ معروف حوالے مبارک علی نے اپنے مضمون میں سابق ہندوستانی ہائی کمشنر کی کتاب کے حوالے سے ایک تقریب کا نقشہ کھینچ کر ہی صرف قائداعظمؒ کی ذات کے بارے میں منفی تاثر دیا بلکہ بلاتحقیق اس بیان اور کھوٹے سکے والی بات کو اچھالا جو صریحاً غلط ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑا اسکالر اسے سمجھا جاتا ہے جو قائداعظمؒ، اقبالؒ، تحریک پاکستان اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر کلہاڑے چلائے اور ہر تاریخی واقعے میں سازش ڈھونڈے۔ ایک مخصوص گروہ اسے روشن خیالی تصور کرتا ہے ان کے نزدیک کسی بھی تحریک کے ضمن میں دین یا دینی امور کا ذکر کرنا رجعت پسندی بلکہ جہالت ہے۔ انہیں اپنا نقطہ نظر مبارک لیکن اپنے موقف کی حمایت میں سند دینا تحقیق کا

بنیادی اصول ہے اور بے پر کی اڑانا یا سنی سنائی باتوں پر مضمون کی بنیاد رکھنا یا ایک واضح طور پر مخالف اور متعصب راوی کے بیانات کو بنیاد بنا کر قوم کے محسنوں کو رگیدنا کہاں کی اسکالر شپ اور کہاں کا انصاف ہے۔ بلاشبہ مبارک علی ایک معروف مورخ ہیں انہیں حال ہی میں ہندوستان کی جانب سے رام کرشنا جے دیال ایوارڈ (Ram Krishna Jaidayal Harnarary Award) ملا ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن واقعات و بیانات کی چھان بین محقق کا بنیادی فرض ہوتا ہے اور ذمہ دار لوگوں سے غیر ذمہ دارانہ رویئے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بات دور نکل گئی شاید بات ہی کچھ ایسی تھی۔ جب یہ مضمون چھپا تو محترم حنیف رامے صاحب سابق وزیراعلیٰ پنجاب کا فون آیا۔ آپ رامے صاحب کے ساتھ سابق وزیراعلیٰ کے ذکر سے حیران نہ ہوں۔ پنجاب کے اقتدار پر شیروں کے علاوہ بھی کچھ شرفا متمکن ہوتے رہے ہیں جنہیں آپ ماورائے اصول یعنی (Exception) کہہ سکتے ہیں اور میں انہیں تاریخ کا حادثہ قرار دیتا ہوں، ایسی ہی ایک مثال جناب حنیف رامے بھی ہیں جو بہت اچھے مصور، مقرر، لکھاری اور ممتاز دانشور ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے باوجود پنجاب کے وزیراعلیٰ رہے۔ بعدازاں اسپیکر بھی رہے ورنہ ہمارے ملک میں تو سیاسی اقتدار دولت مندوں کا مرغوب کھیل (Hobby) ہے چاہے وہ علم و دانش، کردار اور لیڈر شپ سے تہی دامن ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انہوں نے دن دھاڑے لوٹ کر ہی دولت کیوں نہ بنائی ہو۔

محترم حنیف رامے صاحب نے مجھے قائداعظمؒ سے منسوب غلط بیان کہ ''پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا'' کا پس منظر واضح کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم نے ان کو یہ بات کئی بار بتائی تھی کہ جن دنوں 37-1936ء میں قائداعظمؒ کی علامہ اقبالؒ سے خط و کتابت جاری تھی اور وہ دن رات مسلم لیگ کو منظم کرنے

اور اسے ایک عوامی مقبول جماعت بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان دنوں ایک مشہور ہندو انگریز اخبار ٹریبون (Tribune) نے مسلم لیگ اور قائداعظمؒ پر طنز کرتے ہوئے یہ فقرہ لکھا تھا جو چپک گیا اور جیسے غلط رنگ دے کر یار لوگوں نے اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لیا، وہ فقرہ تھا

"After see, what is Muslim League? Mr. Jinnah and his type writer".

یاد رہے کہ یہ فقرہ ہندو اخبار کا طنزیہ تبصرہ تھا، نہ کہ قائداعظم کا بیان...... آپ کو علم ہوگا کہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی علامہ اقبالؒ کے ساتھی، پنجاب میں مسلم لیگ کے اہم کارکن اور ممتاز محقق تھے جن کی کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ اس نازک دور کے شاہد بھی ہیں اور مورخ بھی۔ ان کا حوالہ معتبر اور قابل قبول ہے۔ میں راے صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ گتھی سلجھائی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے ہیں اور حقائق کی روشنی پھیلتی ہے۔ بہر حال یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس طرح 37-1936ء میں لکھا گیا ٹریبون کا یہ فقرہ تاریخ کا حصہ بن گیا اسی طرح 1940ء میں قرارداد لاہور کو ہندو پریس نے طنزاً قرارداد پاکستان کہہ کر مسلم لیگ کی مشکل آسان کر دی تھی۔ قائداعظمؒ کے بقول جو پیغام انہیں عوام تک پہنچانے میں بہت وقت لگتا، وہ ہندو پریس نے قرارداد پاکستان کہہ کر فوری طور پر مسلمانوں تک پہنچا دیا۔

آخر میں مجھے ان تمام حضرات و خواتین اور طلبہ کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میرے ان مضامین اور قائداعظم اور کابینہ مشن والے مضمون پر شکریئے اور حوصلہ افزائی کے خطوط لکھے، ای میل بھجوائی اور فون کئے۔ مقصد فقط کنفیوژن رفع کرنا اور قومی خدمت ہے دعا کیجئے کہ یہ آرزو پوری ہو۔ زندگی مختصر اور سفر طویل ہے۔

فرمانِ قائدؒ

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد معاشرتی انصاف اور اسلامی سوشلزم کے

اصولوں پر رکھی جائے تو بنی نوع انسان کی اخوت و مساوات پر زبردست زور دیتے ہیں تو آپ محض میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسی طرح جب آپ ہر شخص کے لئے مساوی مواقع مانگتے ہیں تب بھی آپ میرے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ترقی کے ان مقاصد کے متعلق پاکستان میں کوئی اختلاف رائے نہیں، کیونکہ ہم نے پاکستان اس لئے طلب کیا تھا، اس کی خاطر جدوجہد کی تھی اور اسے اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے میں جسمانی اور روحانی طور پر قطعاً آزاد ہیں۔ اخوت، مساوات اور رواداری، یہ ہیں ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نکات۔ ہم نے پاکستان کے لئے اس لئے جنگ کی تھی کہ اس برصغیر میں ہمیں ان انسانی حقوق سے محروم کر دیئے جانے کا خدشہ تھا۔ ہم نے ان عظیم تصورات کے لئے اس لئے جدوجہد کی کہ صدیوں سے ہم غیر ملکی حکمرانوں اور ذات پات کے دقیانوسی معاشرتی نظام کے دوہرے تسلط میں تھے۔ یہ دوہرا تسلط مسلسل دو سو سال سے ہم پر طاری تھا کہ ہمیں احساس ہوا کہ اگر یہ کچھ عرصہ اور باقی رہا تو ہم مسلمان انفرادی طور پر بحیثیت انسان اور اجتماعی طور پر بحیثیت قوم صفحۂ ہندوستان سے معدوم ہو جائیں گے۔ اسی لئے پاکستان اور اس کی جدوجہد کی کہانی، عظیم انسانی خیالات و تصورات کو عملی جامہ پہنانے کی کہانی ہے۔ (جلسۂ عام چٹاگانگ، 26- مارچ 1948ء)

روزنامہ جنگ 4- جنوری 2004ء

ڈاکٹر صفدر محمود اور تاریخ نویسی

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر صفدر محمود صاحب ایک بیوروکریٹ اور بااثر شخص ہیں۔ اس لئے جب وہ کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اسے اردو کے تمام اخباروں میں چھپوانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے پچھلے مضمون کے جواب میں جو کچھ تحریر کیا تھا، اور جو روزنامہ ''خبریں'' لاہور میں یکم جنوری میں شائع ہوا، اسے یا تو انہوں نے پڑھا نہیں، یا بہتر یہ سمجھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے اور اپنے موقف پر قائم رہا جائے۔ صفدر محمود صاحب جس قسم کی تاریخ لکھ رہے ہیں، اس کی وضاحت ضروری ہے، کیونکہ اس قسم کی تاریخ نہ صرف حقائق کو مسخ کرتی ہے، بلکہ یہ تاریخ نویسی کے بنیادی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت تین قسم کی تاریخ نویسی کی روایات ہیں۔ ایک وہ کہ جو صوفیاء کے کشف و کرامات کے زیر اثر لکھی جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی نمونے ہم ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب مریدوں نے اپنے مرشدوں کی تاریخ لکھی تو ہر کارنامہ ان سے منسوب کر دیا۔ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، اور بعد میں آنے والے سلاطین کی تمام فتوحات اس قسم کی تاریخ میں ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ یہ صوفی اپنی روحانی سلطنت کے سربراہ ہوتے تھے اور تمام دنیاوی کاروبار ان ہی کی مرضی کے مطابق چلا کرتے تھے۔ بادشاہ و سلاطین کا انتخاب بھی ان ہی کی خواہش پر ہوتا تھا۔ ان تاریخوں کی

بنیاد مریدوں کے عقائد پر ہے، اور اس عقیدت پر جو انہیں اپنے مرشدوں سے تھی۔ ان تاریخوں میں خواب بھی ہیں، غیبی اشارے بھی ہیں، اور پیروں کی روحانی طاقت وقوت کا اظہار بھی ہے۔

دوسری قسم کی وہ تاریخ ہے جو داستانوں، افسانوں اور شاعری میں ہے۔ اس میں شاعر و افسانہ نگار اپنے تخیل کی مدد سے حقائق کو افسانوی بنا کر لوگوں کے لئے دلکشی کا باعث کر دیتے تھے۔ اس کی مثال انارکلی کی کہانی ہے کہ جس کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں، مگر اس کی مقبولیت کی یہ انتہا ہے کہ اس پر کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں اور لوگوں میں اسے پسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔ اس متھ میں اس قدر جاذبیت ہے کہ لوگ اصل حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں۔

تاریخ کی تیسری قسم وہ ہے کہ جسے سائنس کہا جاتا ہے۔ اس میں اول واقعات کا تعین کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کی شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ کیا شہادت اس واقعہ سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ اس میں ماخذوں کے متن کو بغور پڑھا جاتا ہے کہ اس کے بین السطور میں کوئی معنی تو چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اس قسم کی تاریخ لکھنے کے لئے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح سے ایک ڈاکٹر یا انجینئر پروفیشنل ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک مورخ کا پروفیشنل ہونا ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی اب یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ تاریخ کے واقعات کو کسی تھیوری کے فریم ورک میں لکھ کر ان کی تشریح کی جائے۔

اس وضاحت کی روشنی میں دیکھا جائے تو صفدر محمود صاحب کا تعلق اولین قسم کی تاریخ نویسی سے ہے کہ جو خوابوں اور کشف و کرامات کی بنیادوں پر لکھی جاتی ہے۔ اس قسم کی تاریخ ایک خاص طبقہ میں جو محض عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں، ان میں تو مقبول ہو سکتی ہے، لیکن جو لوگ تاریخ کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ تاریخ محض

افسانوی ہے۔

اب اگر پاکستان کی تاریخ اور قائداعظم کی شخصیت کو حقائق سے ہٹ کر، روحانی بنیادوں پر تشکیل دیا جائے تو یہ ان کی حقیقی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہے۔ قائداعظم کی شخصیت کا جس نے بھی بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو جانتا ہے کہ وہ ایک ایماندار، دیانت دار، اور بحیثیت وکیل پروفیشنل تھے۔ وہ قطعی مذہبی نہیں تھے، یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی مذہبی پابندیوں کا خیال نہیں رکھتے تھے نہ ہی وہ عوامی راہنما تھے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ سیاست کے تقاضوں کے تحت انہوں نے مذہب کو استعمال کیا، اور اپنی تقریروں میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست کے طور پر قائم کریں۔ یہ بات ان کی شخصیت، ان کے کردار، اور ان کے خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جاگیرداروں، زمینداروں اور پیروں کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے، چونکہ ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا، اس لئے ایسے تمام افراد کہ جو اپنی خاندانی وراثت پر ناز کرتے تھے ان کے لئے ان کے دل میں کوئی زیادہ جگہ نہیں تھی۔ سندھ کے گورنر سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہزار روپیہ میں کسی بھی جاگیردار کو خرید سکتے ہیں، اس پر گورنر کا کہنا تھا کہ یہ قیمت زیادہ ہے اور وہ محض پانچ سو میں یہ سودا کر سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپوزیشن کو قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کے اردگرد جو لوگ تھے وہ ان کے رعب میں رہتے ہوئے، اکثر خاموشی ہی اختیار کرتے تھے۔ اسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد ہر ایک نے یہی کہا کہ پاکستان محض ان کی ذہانت اور وکالت کی بناء پر بنا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جب وہ گورنر جنرل بنے تو انہوں نے اس کا صاف طور پر اظہار

کیا کہ وہ برائے نام گورنر جنرل نہیں رہنا چاہتے، اس لئے 1935ء کے ایکٹ میں تبدیلی کر کے ان کے اختیارات کو وسیع کیا گیا، اور انہیں اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے سرحد میں صوبائی اسمبلی کو توڑا، اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اسی کے تحت سندھ میں کھوڑو کو چیف منسٹری سے معزول کر دیا۔ وہ گورنر جنرل بھی تھے، تو دستور ساز اسمبلی کے صدر، اور مسلم لیگ کے سربراہ، اس لئے یہ تمام اختیارات ان کی ذات میں جمع تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ تینوں عہدے علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل، مولوی تمیزالدین دستور ساز اسمبلی کے اسپیکر، اور لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے صدر ہوئے۔

صفدر محمود صاحب کو ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ کتابوں میں شائع شدہ ہر بات پکی شہادت نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لئے دیکھنا پڑتا ہے کہ مصنف کون ہے؟ اور کن حالات میں وہ یہ لکھ رہا ہے؟ اور کیا اس کی بات حالات کے مطابق ہے یا نہیں؟

تقسیم ہند کے بارے میں اب تک مختلف نقطہ ہائے نظر سے بہت کچھ لکھا گیا ہے، چونکہ ہندوستان میں تاریخ نویسی کی جڑیں بہت گہری ہیں، اس لئے وہاں اس موضوع پر مورخوں نے بہت کام کیا ہے۔ مگر صفدر محمود صاحب کسی بھی ہندو مورخ کی سند تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اس ضمن میں ان کا چھپا ہوا طنز مجھ پر بھی ہے۔ مجھے حال ہی میں ایک ہندوستان کی غیر سرکاری تنظیم نے ایوارڈ دیا ہے، اس کی مبارک باد تو دی ہے، مگر دل میں چھپے شدید طنز کے ساتھ۔

پاکستان میں تقسیم ہند کی تاریخ کو اب تک فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے لکھا جا رہا ہے جو تاریخ کو منفی انداز میں پیش کرتا ہے، اور تاریخی عمل کو تعصب کی روشنی میں دیکھتے ہوئے غلط نتائج نکالتا ہے۔ اگر اس قسم کی تاریخ کسی بھی معاشرے میں پسندیدگی سے پڑھی جاتی ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کس قدر پس ماندہ اور ذہنی کم مائیگی کا شکار ہے۔ بدقسمتی

سے اس قسم کی تحریریں معاشرے کو اور زیادہ حقائق سے دور لے جاتی ہیں۔ یقیناً اس پس ماندگی کو بڑھانے میں ڈاکٹر صفدر محمود پیش پیش ہیں۔

قائداعظم سے منسوب غلط بیانات اور
ڈاکٹر مبارک کی وضاحت

ڈاکٹر صفدر محمود

میں نے اپنے 25- دسمبر 2003ء والے مضمون بعنوان ''قائداعظم سے منسوب غلط بیانات وحکایات'' میں لکھا تھا کہ قائداعظم سے بہت سے ایسے بیانات منسوب کر دیئے گئے ہیں جو بظاہر غلط ہیں اوران کے لئے کوئی ٹھوس یا ناقابل تردید ثبوت نہیں ملتا لیکن چونکہ انہیں بار بار دہرایا گیا ہے اس لئے اب لوگ انہیں سوچے سمجھے بغیر قبول کر لیتے ہیں اس ضمن میں میں نے لکھا تھا کہ سیاستداں، مقررین اور کالم نگار حضرات تو اپنی تقریروں اور تحریروں کو افسانوی رنگ دینے کے لئے اور زور پیدا کرنے کے لئے ایسی باتیں کہتے اور لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ وہ مورخین جنہیں سائنٹیفک مورخ ہونے کا دعویٰ ہے وہ بھی ایسی باتوں کو بلا تحقیق دہراتے اور قائداعظم کی تنقیص کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی کے مضمون کا حوالہ دیا گیا تھا جو تین برس پہلے ڈان میں شائع ہوا تھا اور جس میں قائداعظم سے دو بیانات منسوب کئے گئے تھے۔ اول یہ کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ڈال دیئے گئے ہیں اور دوم یہ کہ پاکستان میں نے اپنے ٹائپ رائٹر کی مدد سے بنایا۔ اگرچہ وہ سارا مضمون ہی قابل گرفت تھا کہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک

قائداعظم کو آدم بیزار انسان کے طور پر پیش کیا گیا تھا لیکن میں اس بحر بیکراں کو چھیڑنا نہیں چاہتا البتہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذہن میں قائداعظم کی شخصیت کا کیا فریم یا خاکہ اور نقشہ بنا رکھا ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ علم و ادب کی دنیا میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اس لئے نئے شواہد سامنے آنے پر رائے بدلنا ایک قدرتی بات ہے۔ میں دنیاوی طور پر پولیٹیکل سائنس کا طالب علم ہوں اور پاکستان کی تاریخ و سیاست میری دلچسپی کا موضوع ہے۔ مجھے نہ ہی مورخ ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی میں اپنے الفاظ کو حتمی اور حرف آخر قرار دینے کا تصور کر سکتا ہوں۔ یہ ایک علمی بحث تھی جس کا مقصد قائداعظم کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ تھا لیکن افسوس کہ ڈاکٹر مبارک علی ذاتی سطح پر اتر آئے ہیں اور اپنی تحریر کی حمایت میں ناقابل تردید مواد پیش کرنے کے بجائے ذات کو ہدف بنا رہے ہیں، میں ہرگز ادب کا دامن نہیں چھوڑوں گا کیونکہ میں اختلاف کا احترام کرتا ہوں ان کو اپنی سائنٹیفک مورخی مبارک لیکن جہاں جہاں وہ قائداعظم یا تحریک پاکستان کے بارے میں سائنٹیفک تحقیق کی آڑ میں غلط بیانی کریں گے یا سنی سنائی پر نتائج اخذ کر کے ان کے امیج کو مجروح کریں گے وہاں ان سے بہرحال اختلاف کیا جائے گا، قارئین کے شکوک وشبہات رفع کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے وضاحتی مضمون میں لکھا ہے کہ قائداعظم سے منسوب ٹائپ رائٹر والا فقرہ احمد سلیم کی اسکندر مرزا پر کتاب کے تیرہویں باب میں موجود ہے۔ اسکندر مرزا کی یادداشتوں پر مشتمل یہ کتاب احمد سلیم صاحب نے 1997ء میں چھپوائی ہے جس کے مطابق اسکندر مرزا صاحب قیام پاکستان کے فوراً بعد گورنر جنرل آف پاکستان سے ملنے گئے تو انہوں نے قائداعظم سے کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ مسلم لیگیوں کا خیال رکھیں کیونکہ انہوں نے تخلیق پاکستان کے لئے جدوجہد کی ہے جس کے جواب میں قائداعظم نے

کہا ''تم سے کس نے کہا ہے کہ پاکستان کو بنانے میں مسلم لیگ کا حصہ ہے یہ کام میں نے تنہا اپنے اسٹینوگرافر کی مدد سے کیا۔'' میں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اسکندر مرزا کی وفات کے تقریباً اٹھائیس برس بعد ان کی یادداشتوں پر مشتمل یہ کتاب مشکوک ہے اور اس میں بہت سے ایسے افسانوی واقعات دیئے گئے ہیں جن کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اول قائداعظم سرکاری افسران کو اتنی لبرٹی نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کو سیاسی مشورے دیں کیونکہ قائداعظم سرکاری افسران کے سیاست میں ملوث ہونے کے سخت مخالف تھے اس لئے سائنسی تحقیق کے اصول کے مطابق یہ ماننا مشکل ہے کہ اسکندر مرزا نے قائداعظم کو ایسا مشورہ دینے کی جرأت کی ہو یا قائداعظم نے اسکندر مرزا سے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا ہو۔ علاوہ ازیں اس روایت کا راوی اسکندر مرزا ہے راوی ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے کیونکہ سکندر مرزا نہ ہی صرف محلاتی سازشوں، مکروفریب اور جوڑ توڑ کا بادشاہ تھا بلکہ وہ سیاستدانوں سے شدید نفرت بھی کرتا تھا اور بقول خالد بن سید اس نے سیاستدانوں کی کردار کشی کے لئے باقاعدہ مہم چلا رکھی تھی۔ خالد بن سید پاکستان کی تاریخ و سیاست کے اہم محقق اور مورخ سمجھے جاتے ہیں اور انہوں نے ایک بار یہ بتایا تھا کہ اسکندر مرزا نے سیاستدانوں کی کردار کشی کے لئے بہت سی باتیں مشہور کر رکھی تھیں اور قائداعظم سے منسوب یہ فقرہ اسی سلسلے کی اہم کڑی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کا جنازہ نکالنے اور مارشل لاء کے نفاذ میں اسکندر مرزا کا کردار نہایت اہم تھا۔ ایسے راوی کے بیان پر اعتماد کرنا تحقیق کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔

اسی کتاب کے سترہویں باب میں جس کا حوالہ مبارک علی صاحب نے دیا ہے اسکندر مرزا کی شعبدہ بازی کا ایک واقعہ درج ہے قائداعظم کی وفات کے اگلے دن جب اسکندر مرزا کو علم ہوا کہ قائداعظم کے ساتھ آخری دن اچھا سلوک نہیں ہوا تھا تو اس نے فوراً احتجاج کے طور پر اپنا استعفیٰ لکھ لیا لیکن دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد پھاڑ دیا۔ اس میں اشارہ

قائداعظم کے آخری سفر میں ایمبولینس کے خراب ہونے کی جانب ہے۔کیا اسکندر مرزا کی شخصیت کے تناظر میں کیا اس طرح کے افسانوی واقعات پر یقین کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ مرحومین کے خاندانوں کی جانب سے لکھوائی گئی ایسی کتابوں کا مقصد مرکزی کردار کے امیج کو بہتر بنانا اور ہیرو ثابت کرنا ہوتا ہے اور ایسے من گھڑت واقعات کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا جبکہ یہ یادداشتیں خود اسکندر مرزا نے بھی نہیں لکھیں۔ ڈاکٹر مبارک علی سائنٹیفک مورخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی جیسے نیک، حق گو اور کھرے انسان اور مولانا حسرت موہانی جیسے دبنگ، سچے اور نڈر انسان کی بیان کردہ شہادتوں پر تو شبہ کرتے ہیں حالانکہ ان بے لوث حضرات کا ایسے واقعات سے کوئی ذاتی مفاد ہرگز وابستہ نہیں تھا لیکن اسکندر مرزا جیسے مشکوک کردار کی مشکوک بات کو اپنے حق میں دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اپنے اس دعوے کے حق میں انہوں نے دوسری جس کتاب کا ذکر کیا ہے اس کا نام ان کے بقول یہ ہے ''The Sound of Fury: Political Study of M.A. Jinnah'' ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق یہ کتاب مطلوب الحسن سید نے لکھی ہے جو قائداعظم کے ابتدائی سوانح نگاروں میں سے تھے اور اس کے صفحے 347 پر بھی قائداعظم سے ٹائپ رائٹر کی بات منسوب ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مبارک صاحب کو پڑھا لکھا اور فاضل مورخ سمجھتا ہوں اگرچہ ان سے علمی اختلاف کی گنجائش موجود رہتی ہے چنانچہ مجھے ان کے اس حوالے سے صدمہ بھی ہوا اور حیرت بھی کیونکہ ہر وہ شخص جسے قائداعظم کی ذات سے دلچسپی ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ مطلوب الحسن سید نے The Sound of Fury نام کی کتاب کبھی نہیں لکھی۔ مطلوب الحسن سید مرحوم نے زندگی بھر فقط ایک ہی کتاب لکھی جس کا نام ہے Mohammad Ali Jinnah: A Political Study یہ کتاب پہلی بار

1945ء میں چھپی تھی اور اس کا دیباچہ خواجہ ناظم الدین نے لکھا تھا۔اس کا دوسرا ایڈیشن 1953ء میں آیا جس میں کچھ اضافے تھے اور پھر اس کے بعد یہی ایڈیشن بار بار چھپتا رہا۔ اس وقت سے کتاب میرے سامنے ہے اور میں اسے کئی برسوں کے بعد دوبارہ پڑھ چکا ہوں۔اس کتاب میں اس قسم کا کوئی فقرہ نہیں جس کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے اور مطلوب الحسن سید کی یہی کتاب مستند ہے۔

اسی کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن میرے سامنے رکھا ہے جسے 1986ء میں انمول پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے اس کتاب میں بھی یہ فقرہ موجود نہیں میں نے اس ضمن میں کراچی میں پروفیسر شریف المجاہد سے رابطہ کیا جو قائداعظم پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں اور قائداعظم اکادمی کے پہلے ڈائریکٹر بھی تھے۔انہوں نے بتایا کہ میرے مطلوب الحسن سید سے نہایت قریبی تعلقات تھے جو ان کی وفات تک قائم رہے۔میری ان سے سینکڑوں ملاقاتیں اور نشستیں رہیں۔انہوں نے تصدیق کی کہ مطلوب سید کی فقط یہی ایک کتاب ہے اور اس میں قائداعظم سے منسوب ٹائپ رائٹر یا کھوٹے سکے والا کوئی فقرہ موجود نہیں۔ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ قائداعظم کو سمجھتے ہیں تو یقین رکھئے کہ وہ ایسا فقرہ نہیں کہہ سکتے تھے۔یہ محض اسکندر مرزا اور چند سرکاری افسروں کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں جنہیں قائداعظم کا قرب ہرگز حاصل نہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب سید کی کتاب کا کوئی تحریف شدہ اور (Piratecal) ایڈیشن ڈاکٹر مبارک علی کے ہاتھ لگ گیا ہے خود ڈاکٹر صاحب کو علم ہونا چاہئے تھا کہ Sound of Fury نام کی کوئی کتاب مطلوب سید نے نہیں لکھی۔

قائداعظم پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا سلسلہ ہیکٹر بالتھو، مادرملت مس فاطمہ جناح، ایم اے اصفہانی جی الانہ، شریف المجاہد سے لے کر عائشہ جلال اور سٹینلے واپرٹ تک پھیلا ہوا ہے اس کے علاوہ کئی اور کتابوں کے ساتھ ساتھ عبدالرب نشتر جیسے رہنماؤں کی

یادداشتیں بھی چھپ چکی ہیں ان میں سے کئی کتابیں سائنسی تحقیق کے معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن ان کتابوں میں کہیں بھی قائداعظم سے منسوب دونوں فقروں (ٹائپ رائٹر اور کھوٹے سکے) کا ذکر موجود نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس میں کوئی سچائی ہوتی تو اس کا ذکر بار بار اور بہرحال ہوتا کیونکہ ان میں سے بعض مصنفین ۔۔۔۔تو قائداعظم کی ٹانگ کھینچنے کے لئے محض بہانے کی تلاش میں تھے لیکن انہوں نے بھی ان کتابوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جن پر ڈاکٹر صاحب تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کو اصرار رہا ہے کہ قائداعظم نے اس بات کو کئی بار دہرایا ہے کئی بار دہرائی ہوئی بات بڑے بڑے ریسرچ اسکالرز کی نظر سے کیسے اوجھل ہوگئی ہے۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب کو اپنے دوسرے دعوے کے حق میں بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا جس کے مطابق قائداعظم نے کہا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ڈال دیئے گئے ہیں میں یہ بات دہرا رہا ہوں کہ بلاشبہ ان میں سے اکثر کھوٹے سکے ہی تھے لیکن قائداعظم سے منسوب اس فقرے کا کوئی قابل اعتماد ثبوت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان کی حمایت میں ایک سابق سفیر افضل محمود کے مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں یہ راجہ آف محمود آباد سے یہ بات منسوب کی گئی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ سند سائنسی تحقیق کے معیار پر پورا اترتی ہے جس کے ڈاکٹر صاحب علمبردار ہیں؟ کیا یہ فقرہ افضل محمود نے خود راجہ محمود آباد سے سنا؟ کیا افضل محمود کی گواہی قابل اعتماد ہے کیا ان کے پاس اس فقرے کا کوئی ثبوت یا جواز موجود ہے اور کیا راجہ صاحب نے یہ بات صرف افضل صاحب کے کان میں کہی؟ کسی اور شخص یا مصنف یا محقق نے اس کا کھوج لگانے کی یا اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ تاریخ نویسی میں حقائق جانچنے کا ایک طریقہ کار یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق کسی شخصیت سے ہوتا ہے تو اس کے مزاج اور عادات کو دیکھا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق ان دونوں فقروں کی توقع قائداعظم سے نہیں کی جاسکتی البتہ مجھے ان کے سینکڑوں

ایسے فقرے یاد ہیں جس میں انہوں نے قیام پاکستان کے لئے عوامی قربانیوں اور مسلم لیگ کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ مضمون تین برس قبل چھپا تھا تو میں نے ان کی توجہ اس جانب دلائی تھی اب تین برس کے بعد اپنی حمایت میں جو ثبوت وہ ڈھونڈ کر لائے ہیں وہ خود ان کے مقرر کردہ معیار پر بھی نہیں اترتے اس لئے میں اب اس بحث کو ختم کر رہا ہوں وہ اپنی ضد پر قائم رہیں یہ ضد انہیں مبارک۔

9- جنوری کو ڈاکٹر مبارک علی نے پھر ایک مضمون چھپوایا ہے جس میں پھر حقائق کے منافی بات یعنی (Factul Mistake) لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قائداعظم گورنر جنرل بھی تھے تو دستور ساز اسمبلی کے صدر اور مسلم لیگ کے سربراہ بھی ان کی وفات کے بعد یہ تینوں عہدے الگ الگ ہوئے۔ بلاشبہ پاکستان کی منتخب شدہ اسمبلی نے انہیں گورنر جنرل اور دستور سازی کی اہمیت کے پیش نظر دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا لیکن ڈاکٹر صاحب کو علم ہونا چاہئے کہ وہ مسلم لیگ کے سربراہ نہیں رہے تھے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے فوری مسائل سے قدر فرصت ملی تو قائداعظم نے 14- دسمبر 1947ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بلایا جس میں انڈیا مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ الگ الگ معرض وجود میں آ گئیں۔ پاکستان مسلم لیگ کا کنوینر لیاقت علی خان کو مقرر کیا گیا۔ آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس فروری 1948ء میں ہوا جس میں مسلم لیگ کے آئین کی تدوین اور توثیق کی گئی۔ اسی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومتی عہدیدار مسلم لیگ کے عہدوں سے محروم ہو جائیں گے اور یوں حکومت اور پارٹی کو الگ الگ کر دیا گیا۔ پیر مانکی شریف نے یہ ترمیم پیش کی کہ قائداعظم کو اس اصول سے مستثنیٰ قرار دیا جائے لیکن قائداعظم نے یہ کہہ کر تجویز رد کر دی کہ گورنر جنرل کی حیثیت سے مجھے ملک کے تمام طبقات کے مفادات کی نگرانی کرنی ہے اس لئے میں کوئی جماعتی عہدہ نہیں لوں گا۔ چنانچہ چوہدری خلیق الزماں مسلم لیگ

کے چیف آرگنائزر مقرر ہو گئے۔

وہ حضرات جنہیں شکایت ہے کہ قائداعظم قیام پاکستان کو اپنے ٹائپ رائٹر کا مرہون منت سمجھتے ہیں ان کی خدمت میں مسلم لیگ کے 14-دسمبر 1947ء والے اجلاس میں منظور کردہ قرارداد کی چند سطریں پیش کر رہا ہوں یہ قرارداد قائداعظم کی صدارت میں منظور کی گئی جس کے الفاظ یہ تھے "مسلم لیگ کونسل کو بہت خوشی اور اطمینان ہے کہ اس نے اپنا بنیادی مقصد یعنی پاکستان کا قیام، حاصل کر لیا ہے کونسل اسلامیان برصغیر کو ان کی قربانیوں پر خراج تحسین پیش کرتی ہے کونسل کو اعتماد ہے کہ مسلم لیگ نے قائداعظم کی عظیم الشان قیادت میں ایک خودمختار ملک کے قیام کے لئے جو منفرد جدوجہد کی ہے اس میں اسے فتح و کامرانی حاصل ہوئی ہے۔" قائداعظم کے لاتعداد بیانات میں قیام پاکستان کے لئے مسلمان عوام اور مسلم لیگ کو کریڈٹ دیا گیا تھا اور بہرحال قائداعظم ان سیاستدانوں میں سے نہیں تھے جن کا ظاہر و باطن متضاد ہوتا ہے۔

آخر میں میری گزارش ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس نظریئے کی تحریک میں سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی تمام عوامل نے اپنا کردار سرانجام دیا یہ کسی الحادی نظریئے کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آیا جیسا کہ ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں اور نہ ہی محض الحادی نظریات اسے متحد رکھ سکتے ہیں۔ خدارا قائداعظم اور تحریک پاکستان کے بارے میں قارئین کو شکوک و شبہات اور کنفیوژن میں مبتلا کر کے ملک کی بنیادوں کو کمزور نہ کریں۔ یہ کام پہلے ہی ہندو مورخین کر رہے ہیں اور ان کا اپنا ایک ایجنڈا ہے یہ طعنہ بھی غلط ہے کہ میں کسی بھی ہندوستانی مورخ کی سند تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے تو مہاراشٹر کے سابق ایڈووکیٹ جنرل ایچ ایم سیروائی کی کتاب "تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے کیونکہ اس کے ٹرانسفر آف پاور کی جلدوں کی روشنی میں قائداعظم کے سیاسی کردار پر بحث کی ہے البتہ میں ان ہندوستانی مورخین کو متعصب سمجھتا ہوں جو واضح طور پر پاکستان کی جڑوں

پر کلہاڑے چلاتے ہیں ایم جے اکبر ہندوستان کا ایک روشن خیال دانشور، صحافی اور مورخ ہے لیکن انہوں نے نہرو پر اپنی کتاب میں یہ لکھا کہ قائداعظم کی زیارت میں شدید علالت کے دوران جب لیاقت علی خان ان سے ملنے گئے تو قائداعظم نے کہا کہ ''پاکستان بنانا میری سب سے بڑی غلطی تھی'' فرنٹیر پوسٹ میں چھپنے والے مضمون میں مزید یہ اضافہ کیا گیا اگر مجھے اب بھی موقع ملے تو میں نہرو سے ملوں اور کہوں کہ ماضی کی حماقتوں کو بھول جاؤ'' اس کی بنیاد پر امریکہ کے ٹائم میگزین نے 1- دسمبر 1996ء میں پاکستان کے خلاف ایک اسٹوری اچھال دی۔ کیا کوئی صاحب عقل یہ بات سوچ سکتا ہے کہ قائداعظم جو اپنے کارنامے پر نہایت مطمئن اور خوش تھے وہ اس طرح کی بات کر سکتے ہیں؟ قائداعظم کے اے ڈی سی کیپٹن نور حسین نے ڈان میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میں لیاقت علی خان کو قائداعظم کے کمرے میں لے کر گیا اور لیاقت علی خان کی قائداعظم سے ملاقات ون ٹو ون تھی جس میں اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر ریاض شاہ اور باقی اسٹاف نیچے لاؤنج میں تھا۔ لیاقت علی خان قائداعظم سے مل کر نکلے، مس فاطمہ جناح اور اے ڈی سی کے ساتھ کھانا کھایا اور واپس چلے گئے تو پھر یہ بات قائداعظم نے کس سے کہی؟

یہ تاریخ نویسی ہے یا زہریلا پروپیگنڈہ؟ وضاحت کی جائے تو روشن خیال ہمیں رجعت پسندی کا طعنہ دیتے ہیں اور یہ تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ روشن خیال کیا ہوتا ہے!! اب میں اس بحث کو ختم کر رہا ہوں، قارئین فیصلہ خود کر لیں۔

روزنامہ جنگ 26- جنوری 2004ء

قائداعظم کے بارے میں چنداور وضاحتیں

ڈاکٹر مبارک علی

مورخوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک وہ جو کہ تاریخ سے سچائی کو چھپاتے ہیں، اور دوسرے وہ جو کہ سچائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ سچائی کو چھپانے کے پیچھے بہت سی وجوہات ہوتی ہیں، ان میں ذاتی مفادات، خوشامد، حکمراں طبقوں کی خوشنودی اور اپنے نظریات کی روشنی میں واقعات کو توڑ مروڑ کر اور مسخ کر کے پیش کرنا۔ اس سلسلہ میں جس رویہ کو اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ کہ واقعات کے ہونے سے ہی انکار کر دیا جائے یا انہیں نظرانداز کر کے ان کی اہمیت کو کم کر دیا جائے۔ اکثر اس رویہ کو ''قومی مفادات'' کے نام پر بھی جائز اور درست سمجھا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جو معاشرے کسی شخصیت پر مکمل بھروسہ اور اعتقاد رکھتے ہیں، وہ اس شخصیت کو آہستہ آہستہ اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی اصل حقیقت گم ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ پیش آتی ہے ان کی شخصیت کو حکمراں طبقوں سے لے کر دانشوروں اور فلم بنانے والوں تک نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شخصیت، قصہ، کہانیوں اور مفروضات میں مسخ ہو کر رہ گئی۔

ڈاکٹر صفدر محمود صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا تھا کہ میں نے یہ جملہ جس میں

قائداعظم نے کہا تھا کہ "پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے" ان سے غلط منسوب ہے، جب میں نے اسکندر مرزا اور مطلوب الحسن سید کی کتابوں سے حوالے دیئے کہ جن میں دونوں نے اس بات کو مختلف طریقوں اور مختلف اوقات میں ان سے منسوب کیا ہے، تو انہوں نے اسکندر مرزا کو تو اس لئے غلط قرار دیا کہ وہ ایک فوجی اور نا اہل سیاستداں تھے۔ مطلوب الحسن سید کی کتاب کے بارے میں کہا کہ اول تو ان کی یہ کتاب ہی نہیں ہے، پھر کہا کہ شاید "تحریف شدہ" ایڈیشن ہے جو انڈیا سے شائع ہوا ہے۔ ان کے خیال میں چونکہ ہندوستان ہمارا دشمن و حریف ہے، اس لئے وہاں سے آنے والی ہر چیز مخالفانہ ہوگی۔ شاید کسی نے یہ تحریف اس لئے کی تھی کہ میں ڈاکٹر صفدر محمود کو جواب دے سکوں۔ اگر وہ اس کے بارے میں مزید تفتیش کرنا پسند کریں تو میں ان کی خدمت میں اس کتاب کی فوٹو کاپی پیش کرسکتا ہوں۔

اس سلسلہ میں اب تیسرا گواہ مسرت حسین زبیری کو پیش کرتا ہوں کہ جو ایک بیوروکریٹ تھے۔ ان کی کتاب "Voyage through History" جس کے دو ایڈیشن ہمدرد فاؤنڈیشن نے 1984 اور 1987 میں کراچی سے شائع کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے جلد دوم میں یہ جملہ لکھا ہے: (صفحہ نمبر:390)

"The Quadi Azam proud boast that the Muslim League Organization consisted of Jinnah and his on steno, betrayed the organisation's hollowness."

قائداعظم کی فخریہ شیخی کہ مسلم لیگ کی آرگنائزیشن جناح اور ان کے اسٹینو پر ہے، اس سے آرگنائزیشن کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے۔

ان تین حوالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ جملہ قائداعظم نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کی موجودگی میں کئی بار کہا اور اس پر اصرار بھی کیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا

ہے کہ وہ مسلم لیگ اور اس کے دوسرے کارکنوں کو نااہل سمجھتے تھے اور ان پر قطعی اعتماد نہیں کرتے تھے۔اس لئے کھوٹے سکے والی بات بھی منطقی طور پر صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔مسرت حسین زبیری ہی کتاب میں ایک اور واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے راہنماؤں کو کس قدر تحقیر کے ساتھ دیکھتے تھے، مثلاً پاکستان بننے کے بعد جب کسی سوال پر ان راہنماؤں کے رویہ سے ناراض ہوئے تو انہوں نے کینٹ کی ایک میٹنگ میں جہاں ان کے اردگرد وزراء بیٹھے ہوئے تھے۔ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"you, you, you, every one of you is here because I appointed you and let there be no misunderstanding on this point: you are here so long as I want you."

(تم ،تم، تم ،اور تم میں سے ہر ایک جو یہاں ہے، وہ اس لئے ہے کہ میں نے اس کا تقرر کیا ہے۔لہٰذا اس سلسلہ میں کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔تم اس وقت تک یہاں ہو جب تک میں چاہوں گا)(صفحہ نمبر 145)

صفدر محمود صاحب کو ہندوستان کے مورخوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ متعصب ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ہندوستان میں لکھی جانے والی تاریخوں کے بارے میں معلومات ہی نہیں ہیں۔ہندوستان میں مورخ تاریخ کو ایک نہیں بلکہ کئی نقطہائے نظر سے لکھ رہے ہیں۔ان میں قوم پرستی ،سبالٹرن (یا عوامی تاریخ) مارکسی، کلچرل، سیکولر اور فرقہ وارانہ۔ہندوستان میں اس وقت کوئی مورخ فرقہ وارانہ تاریخ لکھنے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کی عالمی شہرت ہو، جبکہ دوسری طرف سے روشن خیال اور سیکولر مورخوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان میں رومیلا تھاپر، بپن چندر، عرفان حبیب، ہربنس مکھیا، گیان پانڈے، مشیر الحسن اور شاہد امین شامل ہیں۔حال ہی میں تقسیم کی جو تاریخ پر کام ہوا ہے، اس میں اس کو عورتوں،

مہاجروں، اور فرقہ وارانہ فسادات کی روشنی میں دیکھا گیا ہے اس سلسلہ میں گیان پانڈے کی تقسیم پر کتاب ایک اچھا مطالعہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں صرف فرقہ وارانہ نقطۂ نظر ہے کہ جس میں ہندو دشمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ صفدر محمود اسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ نقطہ نظر نوجوان نسل کو حقائق سے دور لے جا کر انہیں گمراہ کر رہا ہے۔

قائداعظم کی شخصیت کے سلسلہ میں اور بہت سی باتیں ہیں، جن کی وضاحت ضروری ہے۔ مثلاً ان کا اصلی نام محمد علی ''جینا'' تھا۔ ''جناح'' بعد میں ہوا۔ سندھ کی پرانی نصاب کی کتابوں میں ان کی پیدائش ''جھرک'' میں بتائی گئی ہے، کراچی میں نہیں۔ ان کی 25 دسمبر کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی شبہات ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان باتوں کی وضاحت کی جائے، تو اس سے ان کی شخصیت قطعی کم نہیں ہوگی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نتیجہ میں وہ ایک عام انسان کی شکل میں آئیں گے کہ جن کے گرد روحانی حلقہ یا ہالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہیں عبادت گزار اور مذہبی بنانے سے ان کی عزت میں اضافہ نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں، یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ قائداعظم کا مطالعہ ایک تاریخی شخصیت کے طور پر کرنا چاہئے۔ وہ ایک خاص ماحول، وقت اور حالات کی پیداوار تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں، لوگوں کے رویئے اور رجحانات بھی بدل گئے ہیں، اب نئے مسائل ہیں، نئے چیلنجز ہیں، ان سے نمٹنے کے لئے نئے خیالات اور نظریات کی ضرورت ہے۔ یہ خیالات اور افکار اسی وقت تخلیق ہوں گے کہ جب ماحول آزاد ہوگا، اور کسی نظریہ کی جکڑ میں نہیں ہو گا۔ بصورت دیگر معاشرہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جائے گا۔ جیسا کہ اس وقت ہے۔

اس لئے جب اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر قائداعظم زندہ رہتے تھے تو پاکستان کی یہ حالت نہ ہوتی، یہ فقرہ ایک مجبور و لاچار قوم کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے کہ جس کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں ہے۔ امریکی صدر ٹامس جیفرسن نے ایک بار کہا تھا کہ ''مردہ لوگوں کا زندوں پر حکومت کا کوئی حق نہیں ہے'' اس فقرہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں، میں عرض کروں کہ مجھے صفدر محمود صاحب سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہے۔ مگر بحیثیت مورخ یہ میری ذمہ داری ہے کہ اگر واقعات کو مسخ کیا جائے، تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو اس کی درستگی ضروری ہے تا کہ معاشرہ گمراہ نہ ہو۔

(ایک بات کا اضافہ اور کر دوں کہ "خبریں" کے علاوہ اردو کے دوسرے اخباروں نے میرے جوابات شائع نہیں کئے۔ جب کہ یہ صفدر محمود صاحب کے مضامین بلا کم و کاست چھاپتے رہے ہیں۔ یہ فرق ہے ایک بیورو کریٹ اور مورخ کے درمیان۔)

پاک بھارت تعلق کا مرحلہ اور مسخ شدہ تاریخ

حسن نثار

اللہ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔

اتنی بڑی خوشی اور خوش خبری تو 56 سال میں نصیب نہیں ہوئی لیکن کچھ ''گنجے سیمسن'' صف ماتم بچھا کر تھری پیس سوٹ پہنے باجماعت ماتم میں مصروف ہیں کہ ان کی ناک کٹ گئی حالانکہ ان کی ناک ہی نہیں تھی......اسی لئے تو یہ ''جذباتی شہکار'' ناک سے آگے کیا اس کے پیچھے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ورنہ پاک بھارت تعلقات کی نارملائزیشن کے دیباچے پر ہی دوہتڑ مارنا اور چیخنا چلانا شروع نہ کردیتے کہ ابھی تو ہوا ہی کچھ نہیں۔

جتنا معمولی آدمی......اتنی ہی غیر معمولی انا۔

جتنا چھوٹا آدمی......اتنی ہی بڑی انا۔

صدر پرویز مشرف کے ساتھ ایک ہزار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہیں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ جنگوں میں عملی طور پر شریک رہنے، موت سے آنکھ مچولی کھیلنے، میدان جنگ میں زخمی ہونے والے ایک سپاہی، ایک کمانڈو اور چیف آف دی آرمی سٹاف سے زیادہ خوددار اور جی دار پاکستانی ہے تو پھر ہمیں من حیث القوم اجتماعی خودکشی کر لینی چاہئے۔

بھارت کے ساتھ مکالمہ اور معاملات کو ایک ''کن ٹٹے'' کی آنکھ سے دیکھنا اور رنگ باز بدمعاشی کی زبان سے بیان کرنا مناسب نہیں۔ صدر مشرف نے سو فیصد درست کہا کہ

موجودہ صورت حال کو کسی کی شکست یا فتح کے حوالے سے دیکھنا مناسب نہیں۔ واقعی میں یہ نہ کسی کی فتح ہے نہ شکست...... فتح ہے تو اس پورے خطہ بلکہ بنی نوع انسان کی اور شکست ہے تو شیطانی قوتوں اور ان نفرت فروشوں کی جن کے چھابوں میں کوڑھ زدہ نفرت کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں...... لیکن یہ ''ڈائیلاگ باز'' پورا زور لگا کر دیکھ لیں، نیک نیتی یا بدنیتی پر استوار ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ عوام نہ انہیں گھاس ڈالیں گے نہ کسی تحریک میں ان کا چارہ بنیں گے کیونکہ عوام جان چکے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو کبھی ''بحیلہ مذہب'' اور کبھی ''بنام وطن''...... عوام کو کفن پہنا کر خود خلعت فاخرہ پہنتا رہا ہے۔

ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ کبھی ہم اس برصغیر میں غیر ملکی ''فاتح'' اور اجنبی تھے تو کروڑوں تک یونہی نہیں پہنچ گئے...... مقامیوں نے بڑی محبت سے گلے لگایا اور سوائے برہمنوں وغیرہ کے باقی دلت، ملچھ، شودر تو ہمارے فطری اتحادی ہیں۔ 1857ء کی ناقص ''جنگ آزادی'' بھی ہم نے گورے کے خلاف مل کر لڑی تو آج ہم مل جل کر یہی ''جنگ آزادی'' بھوک، ننگ، غربت، جہالت کے خلاف کیوں نہیں لڑ سکتے ؟؟؟

(برصغیر سپین کیوں نہیں بن گیا؟)

بھارت اگر ہم سے 5,6 گنا بڑا ہے تو یہ ''گناہ'' میں نے نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی زندہ زمینی حقیقت ہے جسے کوئی احمق ہی جھٹلا سکتا ہے اور یاد رہے تاریخ کا یہ اصول اور سبق کہ جو زمینی حقائق کو نہیں سمجھتے...... زمین ان پر تنگ کر دی جاتی ہے...... بہر حال بات صرف اتنی ہے کہ ہندو مسلم منافرت اور نفرت کے نیم خواندہ سفیروں نے سنجیدہ اور سائنٹیفک تاریخ نہیں...... تاریخ کے نام پر ''افسانے'' ہی پڑھے ہیں، حقیقی تاریخ نہ ان کا نصاب تھی نہ نصیب۔ ان کا ایک مسئلہ جذباتیت دوسرا انگریزی زبان یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ عہد جدید میں ہم نے صرف...... صرف اور صرف ایک مورخ کو جنم دیا جس کا نام ڈاکٹر مبارک علی ہے...... باقی سب مداری یہی ڈاکٹر مبارک لکھتے ہیں۔

’’مسلمان دور حکومت‘‘ کی اصطلاح انگریزی عہد کی پیداوار ہے اس کا مقصد اختلافات کو بڑھا کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنا تھا اور ہندوؤں میں یہ احساس پیدا کرنا تھا کہ وہ ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے غلام رہے ہیں اور انگریز نے آ کر انہیں اس غلامی سے نجات دلائی ہے تا کہ وہ مسلمانوں کے دور حکومت کو اپنے لئے باعث ذلت سمجھتے ہوئے انگریزی اقتدار کو نعمت سمجھ کر قبول کر لیں اور ان کے ساتھ مفاہمت کریں‘‘ (ہے کوئی جو اسے چیلنج کر سکے؟)

نوجوان نسل یہ جان لے کہ ہندو مسلم تعلق کی جو تاریخ...... بلکہ سچ کہیں تو نام نہاد تاریخ اس نے پڑھی ہے یا پڑھائی گئی ہے تو وہ انگریزوں کی تاریخ ہے یا دونوں طرف کے برہمنوں کی لکھی گئی تاریخ جو عوام کو جذباتی طور پر ایکسپلائٹ کرنے کے بعد انہیں ’’جانور‘‘ بنا کر ان سے بار برداری کا کام لینا چاہتے تھے ورنہ حقیقتیں تو اتنی ننگی اور زہریلی ہیں کہ منظر عام پر آ جائیں تو کہرام مچ جائے، قیامت آ جائے لیکن ذاتی طور پر نہ مجھے کہرام سے کوئی دلچسپی ہے نہ قیامت کا انتظار...... میرا مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ میرے ہم مذہب اور ہم وطن کسی ’’واردتیئے‘‘ کی واردات کا شکار ہونے کی بجائے اپنے طور پر حقائق کو جاننے کی کوشش کریں۔ مراعات یافتہ اور نام نہاد اشراف نے اس ملک میں بے پناہ فکری گندگی اور پراگندگی پھیلائی ہوئی ہے...... یہ اجلاف کا...... یعنی عوام کا کام ہے کہ اپنے محنتی اور پاکیزہ ہاتھوں سے یہ ’’فکری غلاظت‘‘ صاف کرنے کے بعد نام نہاد اشراف سے اس کا منصب چھین لیں۔

ہمایوں کا مقبرہ ہمک رہا ہے
تاج محل بلا رہا ہے
التمش کی قبر اور قطب مینار میرا منتظر ہے
ٹیپو سلطان کا مزار میری راہ دیکھ رہا ہے

پانی پت، ترائن اور فتح پور سیکری میرے خوابوں کی سرزمین ہے۔

جالندھر کی خاک پر میرے دادا، پردادا اور ان کے پردادا کے قدموں کے نشان ہیں......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمان مجھے......اور میں ان سے گلے ملنے لئے بے تاب اور بے چین ہوں۔

نفرت کے نیم خواندہ سفیر اور مصنوعی انا کے ''ہنچ بیک'' جو چاہے کر لیں......یہ ہونا ہے......آج نہیں تو کل نہیں تو پرسوں......یہ ہو کے رہے گا!

روزنامہ جنگ 11-جنوری 2004ء

قائداعظمؒ کی آخری علالت اور تاریخی حقائق

ڈاکٹر محمود بخاری

میں ڈاکٹر صفدر محمود کا احترام کرتا ہوں۔ انہوں نے کافی کچھ لکھا ہے مگر یہ ان کی تصانیف کم اور تالیفات زیادہ ہیں۔ وہ تحریک پاکستان کے چشم دید گواہ ہیں نہ ہی انہیں کبھی قائداعظم سے ایک سٹوڈنٹ کے ناتے ہی ملنے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔ پاکستان کے کسی بھی بڑے حادثے یا واقعے سے ان کا براہ راست قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ میں نے قائداعظم کے 1938ء اور بعد کے کئی جلسوں میں شمولیت کی ہے۔ میں اسلامیہ کالج میں اس محافظ دستہ میں بھی شامل تھا جو شمشیر بکف قائداعظم کو سلامی دے کر سٹیج پر لایا تھا اور ان کے عقب میں ازراہ احترام کھڑا تھا۔

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش مرحوم کا قریب ترین سٹوڈنٹ اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا یونین پریذیڈنٹ تھا۔ مجھ پر بے حد اعتماد بھی کرتے تھے۔ قائداعظم کے بارے میں مرحوم ڈاکٹر الٰہی بخش کی کتاب ''My Last Days With Quaid-e-Azm'' کے اصلی مسودہ کو شائع ہی نہ ہونے دیا گیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم نے بار دگر بہت قطع و برید اور دشمنوں کے دندان آز سے بچتے ہوئے سرسری ذکر کے ساتھ یہ کتاب شائع کروائی۔ مگر اسے بھی ضبط کر لیا گیا۔ تیسری ترمیم شدہ کتاب کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ کرنل الٰہی بخش اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں نے

بھی کی اوران کے ایک دومعتمد ڈاکٹروں (ڈاکٹر جمیل وغیرہ) نے بھی کی۔

اس تمہید کے بعد میں ڈاکٹر صفدر محمود کے بیان کی طرف آتا ہوں وہ چشم دید گواہ ہیں نہ کوالی فائڈ جج ہیں مستند محقق ہیں نہ ماہر قانون ہیں نہ مستند تاریخی نقاد۔ نہ جانے کس بناء پر انہوں نے اپنی رائے کو مجتہدانہ سمجھ لیا۔ مندرجہ بالا مضمون میں ان کا استدلال بے حد کمزور مبہم اور محض ذاتی گمان پر مبنی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قائداعظم تپ دق کے دیرینہ مریض تھے۔ اس بیماری کا 1940ء کے عشرے میں کوئی موثر علاج نہ تھا یہ بھی حقیقت ہے کہ قائداعظم بمبئی کے ماہر معالج ڈاکٹر جے اے ایل پٹیل کے مریض تھے اور قائداعظم نے ہی پٹیل کو اخفائے راز کی تاکید کی بھی اور پیشہ ورانہ حلف (QATH)HIPPOCRATIC کے تحت ہر باضمیر ڈاکٹر اخفائے راز کا پابند تھا۔ قائداعظم بہت مرتبہ ڈاکٹر پٹیل کے پاس گئے تھے اور ان کے ایکسرے بھی اس کی خفیہ فائلوں میں موجود تھے اور خود قائداعظم کے پاس بھی اس کا ریکارڈ موجود تھا۔ اسی ریکارڈ کی روشنی میں جب ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو مشورہ کے لئے طلب کیا گیا تو وہ اپنی ٹیم میں ڈاکٹر ریاض علی شاہد پروفیسر امراض تپ دق میو ہسپتال، ڈاکٹر ایس ایس عالم پروفیسر ریڈیالوجی اور ایکسرے میو ہسپتال اور ایک پیتھالوجی (غلام محمد) کے پروفیسر کو ساتھ لے گئے۔ یہ پوری ٹیم محض ٹی بی انفکشن کے لئے مخصوص تھی۔ قائداعظم کے دونوں پھیپھڑے (LUNGS) بری طرح متاثر تھے اور ہر لنگ کے اوپر کے حصہ میں ایک سوراخ (CAVITY) ہو جو کہ ایک چھوٹے اخروٹ کے برابر تھی۔ یہ ایکسرے، خون کا ریکارڈ، بلغم کا امتحان اور دیگر ٹیسٹ مرض کی کافی پیش رفت کی نشاندہی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اگر یہ زخم یا (CAVITY) صرف ایک پھیپھڑے تک محدود ہوتی تو شاید ریاض علی شاہ ایک پھیپھڑے کی نس بندی (PHRENIC CRUSH) کر دیتے۔ مگر دونوں پھیپھڑوں (LUNGS) کی صورت میں یہ دوطرفہ فرینک کرش ہرگز سودمند نہ ہوتا۔ انہی

دنوں تازہ تازہ ایک دوا سٹر یپٹو مائی سین (STREPTO MY CIN) ایجاد ہوئی تھی۔ جو کہ کرنل الٰہی بخش اور ان کی ٹیم نے امپورٹ کروائی اور اس سے قائداعظم کو کافی افاقہ ہوا۔ کرنل الٰہی بخش سے منسوب ڈاکٹر صفدر محمود کا یہ بیان مستند نہیں ہے کہ لندن کے ڈاکٹروں نے معدہ کی بیماری تجویز کی اور آپریشن علاج بتایا اور جرمنی کے ڈاکٹروں نے معدہ کو تندرست قرار دیا اور بمبئی کے ڈاکٹروں نے دل کی بیماری بتائی۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بیانات میں واضح تضاد ہے۔ کجا تو وہ بمبئی کے ہندو ڈاکٹر کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں اور دوسری جگہ بمبئی کے کئی ڈاکٹروں کا ذکر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود رقم طراز ہیں کہ جون 1948ء میں قائداعظم کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق وہ کوئٹہ چلے گئے۔ جون کے اواخر میں انہیں زیارت لایا گیا جولائی میں انہیں سردی لگی اور وہ کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گئے۔ کرنل الٰہی بخش جو میڈیکل سپیشلسٹ تھے انہیں اور ریاض علی شاہ چیسٹ سپیشلسٹ کو بلایا گیا۔ صفدر محمود نے دونوں کو چیسٹ سپیشلسٹ قرار دیا ہے۔ حالانکہ ریاض علی شاہ ٹی بی سپیشلسٹ تھے۔ اس سے ڈاکٹر صفدر محمود کی تفاصیل سے لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علاج اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اے ڈی سی کی غیر مصدقہ گفتگو کا غیر ضروری حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش پر قائداعظم کو بے پناہ اعتماد تھا اور وہ قائداعظم کی خواہش پر لیاقت علی خان وغیرہ کو ملاقات کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح اور کرنل الٰہی بخش نے صاف لکھا ہے کہ لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل بغیر اطلاع اچانک آن دھمکے۔ مگر فاطمہ جناح اور کرنل الٰہی بخش نے مریض کے مزاج کے خلاف ان کو چند منٹ سے زیادہ ٹھہرنے نہ دیا۔ یہ محض جھوٹ ہے کہ قائداعظم نے وزیراعظم سے خوشدلی سے ملاقات کی۔

بقول صفدر محمود نور حسین نے کیا خوب انتظام فرمایا کہ معمار قوم قائداعظم کی اس شدید

بیماری کی حالت میں آمد کو پرائیویٹ ظاہر کیا۔ پرائیویٹ سے ان کی کیا مراد ہے ایک ٹوٹی پھوٹی بغیر پٹرول کے پرانی ایمبولینس جس میں آکسیجن سلنڈر اور ایمرجنسی تنفس کا معمولی انتظام بھی نہ تھا۔ ایک پرانے سٹریچر پر ڈال کر کسمپرسی کے عالم میں قائداعظم کو ایمبولینس میں لایا گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود جانتے ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح نے ایمبولینس کی خرابی کا ذکر بڑے دکھ سے کیا ہے۔ کیا اس سے بڑی کسی گواہی کی ضرورت ہے۔ کئی گھنٹے ضائع کرنے کے بعد قائداعظم کو گورنر ہاؤس پہنچایا گیا اور وہاں بھی کسی ایمرجنسی دوا، انجکشن، آکسیجن، آئرن لنگ یا۔۔۔ مشین وغیرہ کا ہرگز اہتمام نہ تھا۔ اسی رات ساڑھے دس بجے قائداعظم کا انتقال ہو گیا۔ وہ کوئی بھی وصیت نہ کر سکے نہ ہی کوئی سننے کو تیار تھا۔ لیاقت علی خان موقع سے غائب رہے۔ میں مطالبہ کروں گا کہ اس قتل کی از سر نو تفتیش کی جائے۔ کرنل الٰہی بخش کی روح خود آ کر پوری گواہی دے گی۔

ڈاکٹر صفدر محمود نے پورا زور قلم اس بات پر صرف کیا ہے کہ قائداعظم نے کبھی بھی یہ نہ فرمایا تھا کہ پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا۔ گاندھی، نہرو، پٹیل، ماؤنٹ بیٹن اور دنیا بھر کے اہل دانش و بینش اور پریس نے تسلیم کیا ہے کہ اگر جناح صاحب اور ان کا آہنی عزم و استقلال نہ ہوتا تو کبھی بھی پاکستان نہ بنتا۔ ڈاکٹر صفدر محمود صرف علامہ اقبال کے مکتوبات ہی مطالعہ فرما لیں کہ جن میں انہوں نے قائداعظم سے لندن کے قیام کے دوران بارہا گزارش کی کہ آپ ہندوستان میں آ کر امت مسلمہ کی نجات کے لئے رہنمائی فرمائیں کیونکہ کوئی بھی قابل ذکر شخصیت برصغیر میں آپ کے سوا موجود نہیں۔ درحقیقت مسلم لیگ کو فعال اور با مقصد مسلم لیگ صرف قائداعظم نے بنایا۔ تاریخ پاکستان کا ہر دور قائداعظم کے اس فرمان کی زندہ گواہی ہے کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ انہی کھوٹے سکوں نے بعد میں ایوب خان اور یحییٰ خان غلام محمد اور سکندر مرزا پیدا کئے اور پاکستان کو دولخت کیا۔ ابھی تک نہ دستور مکمل ہوا ہے اور نہ ہی کوئی قابل قدر نظام معرض وجود میں آیا ہے۔

روزنامہ جنگ 19- جنوری 2004ء

قائداعظمؒ اور ڈاکٹر صفدر محمود کی تاریخ

عمران خواجہ

ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح میرے پاس بھی قائداعظمؒ کی عظمت کو سلام پیش کرنے کے لئے الفاظ موجود نہیں۔ آپؒ نے جن قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمارے لئے پاک سرزمین کے حصول کو ممکن بنایا، تاریخ عالم نے انہیں اپنے اوراق میں بعد میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جناحؒ کی شخصیت کو خراج پیش کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی ذات سے متعلق جب بھی کوئی بات کہی یا لکھی جائے تو پوری ذمہ داری کے ساتھ حقائق کو ملحوظ رکھا جائے۔ محض قیاس آرائیوں اور خیالات و مفروضات کے آئینے میں ان کی ذات کو دیکھنے سے گریز کیا جائے۔ اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر صفدر محمود کے دو مضامین ''کیا قائداعظمؒ سیکولر تھے'' اور ''قائداعظمؒ سے منسوب غلط بیانات و حکایات'' ہیں۔ ان مضامین میں تاریخی حقائق کے برعکس پیش کئے جانے والے نکات کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1)۔ قائداعظمؒ اور رتی کا نکاح، (2)۔ جناحؒ کی زیارت میں لیاقت علی خان کو وصیت تجہیز و تکفین و دیگر امور، (3)۔ ایمبولینس کی خرابی حادثہ یا سازش، (4)۔ قائداعظمؒ بحیثیت خالق پاکستان اور مسلم لیگ اور (5)۔ بیانات و حکایات اور ان کی تصدیق۔ یہ وہ نکات ہیں، جن میں ڈاکٹر صفدر محمود نے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، یا غلط رنگ دینے کی

کوشش کی ہے۔ قائداعظمؒ اور رتی ڈنشا کے نکاح کا واقعہ ڈاکٹر موصوف نے اپنے مضمون ''کیا قائداعظمؒ سیکولر تھے؟'' میں یوں بیان کیا ہے:

''1918ء میں انہوں نے بمبئی کی ممتاز شخصیت سر ڈنشا پیٹیٹ کی بیٹی رتی سے شادی کی تو شادی سے قبل قبول اسلام کی شرط رکھی۔ رتی ڈنشا پہلے مسلمان ہوئیں اور پھر ان کا نکاح محمد علی جناحؒ سے ہوا۔ میں نے اس حقیقت کی مولانا شاہ احمد نورانی سے تصدیق کی ہے کہ محمد علی جناحؒ رتی ڈنشا کو مولانا شاہ احمد نورانی کے سگے تایا مولانا نذیر صدیقی کے پاس لے کر گئے، جنہوں نے انہیں مسلمان کیا اور ان کا نکاح قائداعظمؒ سے پڑھوایا۔'' انہوں نے مزید لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق اثنا عشری مکتب فکر سے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خاندان کا مذہبی پس منظر یہی تھا، تو پھر انہوں نے اپنی ہونے والی بیوی کو قبول اسلام اور اپنے عقد میں لینے کے لئے اور نکاح پڑھوانے کے لئے کسی ایسی مذہبی شخصیت کا انتخاب کیوں نہ کیا، جس کا تعلق اثنا عشری مکتب فکر سے ہوتا۔ ظاہر ہے کہ شیعہ علماء کی بمبئی میں کوئی کمی نہ تھی۔''

قارئین کرام! نوٹ فرمالیں کہ سر ڈنشا پیٹیٹ کی بیٹی رتی (جن کا قبول اسلام کے بعد نام مریم تھا) کے ساتھ محمد علی جناحؒ کا نکاح حاجی محمد حسن نجفی نے پڑھوایا، جو بمبئی کی اثنا عشری کھوجہ جماعت کے مجتہد اور اسی برادری کی مسجد کے پیش امام تھے۔ اس نکاح میں قائداعظمؒ کے نمائندہ راجہ صاحب محمود آباد تھے، جبکہ رتی کی نمائندگی محمد حسن نجفی نے کی۔ یہاں یہ تاریخی وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ رتی کو جناحؒ نے بمبئی کے اثنا عشری قبرستان ہی کی ایک لحد میں سپرد خاک کیا اور یہ بیان کرنا بھی ناگزیر ہے کہ قائداعظمؒ کے معتمد رفیق ابوالحسن اصفہانی نے عدالت عالیہ سندھ میں ایک بیان حلفی بھی داخل کیا۔ ظاہر ہے اصفہانی نے شیریں بائی کیس میں، جس وقت یہ بیان حلفی داخل کیا تھا، مولانا شاہ احمد نورانی بقید حیات تھے۔ ایسی صورتحال میں اگر اصفہانی جیسے ذمہ دار پاکستانی کے بیان حلفی میں صداقت

نہ ہوتی، تو مولانا نورانی اس پر کبھی خاموش نہ رہتے، بلکہ سراپا احتجاج بن جاتے۔ اس واقعہ کی تفصیل مؤرخ خالد احمد کی کتاب ''قائداعظمؒ کے خاندانی تنازعے'' کے صفحہ پر 35 پر موجود ہے۔

میری گزارشات کے نکتہ دوم کا تعلق لیاقت علی خان کی زیارت میں قائداعظمؒ کے ساتھ طے شدہ یا غیر طے شدہ (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا) ملاقات میں قائداعظمؒ کی خان صاحب کو وصیت تجہیز و تکفین اور دیگر حقائق سے ہے۔ ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں: ''وہ ان پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ لیاقت علی خان کی قائداعظمؒ کے ساتھ ون ٹو ون ملاقات کوئی گھنٹہ بھر سے زیادہ جاری رہی۔ اس ملاقات سے قبل ڈاکٹر قائداعظمؒ کو بتا چکے تھے کہ انہیں ٹی بی ہے، جو تقریباً دو سال پرانی ہے۔ لیکن انشاء اللہ وہ تندرست ہو جائیں گے، جبکہ محترمہ جناحؒ کا کہنا ہے کہ وہ قدرے مایوس ہو گئے تھے۔ قائداعظمؒ سے ملاقات کے بعد لیاقت علی خان نے مس جناحؒ اور قائداعظمؒ کے دونوں اے ڈی سی حضرات کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران وزیراعظم نہایت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ محترم نور حسین صاحب کا خیال ہے کہ اس ملاقات میں قائداعظمؒ نے لیاقت علی خان کو اعتماد میں لے کر اپنی بیماری کا بتا دیا تھا اور ساتھ ہی تجہیز و تکفین کے بارے میں تفصیلی ہدایات دے دی تھیں، تا کہ کوئی مذہبی فرقہ ان کے مذہبی عقیدے کے بارے میں غلط فہمی پیدا نہ کر لے۔''

قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب ''شہاب نامہ'' کے صفحہ 430 پر ان بداعتمادیوں کا ذکر قائداعظمؒ کے بیان کئے ہوئے الفاظ کی روشنی میں محترمہ فاطمہ جناحؒ کے حوالے سے یوں کیا ہے:

"Fati do you know why he has come?" I said I would'nt be able to guess the reason. He said "He wants to know how serious my sickness is. How long I will las."

جہاں تک گورنر جنرل سے ملاقات کے بعد وزیراعظم کی افسردگی کی بات ہے، تو اس کی تفصیل یوں عیاں ہو رہی ہے:

"I found the Prime Minister on the dinner table in a jolly mood, cracking jokes and laughing, while I shivered with fright about his health, who was alone in his sick bed. Chaudhri Mohammad Ali was silent, thinking."

اب ان حالات میں بھی اگر کوئی صاحب اس ملاقات کو قابل اعتماد فضا میں ہونے والی ملاقات قرار دینے پر تل آئیں اور محض کسی کے ذاتی خیال کو سند کا درجہ دیتے ہوئے بیان کریں کہ قائداعظمؒ نے اس وقت نقاہت میں جبکہ وہ بستر علالت سے اٹھنے سے قاصر تھے اور بات صرف ہاتھ کے اشاروں کی حرکت تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ تعلقات عدم اعتمادی کا شکار ہو چکے تھے، لیاقت علی خان کو جناحؒ نے اس ون ٹو ون ملاقات میں کوئی وصیت کی ہو، یا اپنی بیماری کی بابت باخبر کیا ہو۔ اس سوچ پر حیرت زدہ ہونے کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے! ظاہر ہے اس موقع پر ڈاکٹر الٰہی بخش تو وہاں موجود تھے اور اگرچہ وزیراعظم کے استفسار پر ڈاکٹر نے جناحؒ کی بیماری کی تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا تھا، پھر بھی اگر قائداعظمؒ کو وزیراعظم کو بیماری کی تفصیلات فراہم کروانا مقصود ہوتیں تو حکم قائد پر ڈاکٹر کو ان تفصیلات کی فراہمی میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔

قائداعظمؒ کی تجہیز و تکفین کے حوالے سے بھی ڈاکٹر صفدر صاحب نے افسانوی رنگ میں ایک جملہ رقم کیا ہے "حضرت قائداعظمؒ کی نماز جنازہ ممتاز مذہبی شخصیت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی، جن کا مسلک اظہر من الشمس ہے۔" اگرچہ یہاں تک درست ہے کہ لاکھوں افراد کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر نے اپنے عظیم قائد کے سفر آخرت کو پرسہ دینے کے لئے ان کی نماز جنازہ علامہ شبیر احمد عثمانی کی امامت میں ہی پڑھی، جن کا مسلک

اظہر من الشمس ہے، مگر اس تاریخی حقیقت سے چشم پوشی کیونکر اختیار کی جائے کہ شیخ ہدایت حسین وغیرہ جب جناحؒ کی میت کو غسل دے چکے تو پہلی نماز جنازہ گورنر جنرل ہاؤس میں انیس الحسنین نے بھی پڑھائی، جن کا مسلک بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس نماز جنازہ کے شرکاء میں ہاشم رضا، یوسف ہارون، قاسم رضا اور حاتم علوی جیسی پاکستانی شخصیات شامل تھیں۔ یہ بات ماورائے شک ہے کہ قائداعظمؒ کسی مسلکی معاملے میں الجھے بغیر مسلمانوں کے نجات دہندہ تھے، مگر بشریت کے تقاضوں اور ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ان سے بھی ماورا تھے، تو یہ بے بنیاد سوچ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر صفدر نے اپنے مضمون میں خیال ہی کی روشنی میں قائداعظمؒ کی ایمبولینس کی خرابی کو ایک معمول کے حادثاتی واقعہ سے تعبیر کیا ہے اور اتنے عظیم قومی سانحہ کو صرف غفلت کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ اس خدشاتی نظریئے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر تاریخ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد ہماری اتنی رہنمائی تو کر رہی ہے کہ محترمہ کچھ اہم قومی واقعات سے پردہ چاک کرنا چاہتی تھیں، مگر محترمہ کے اس عزم کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی رہیں۔ اس وقت کی حکومت نے محترمہ جناحؒ کو اپنی مشروط خواہشات سے آگاہ کرتے ہوئے قوم سے خطاب کے سندیسے دیئے، مگر قائداعظمؒ کی پہلی دونوں برسیوں پر فاطمہ جناحؒ نے اس پر مثبت جواب نہ دیئے، پھر جناحؒ کی تیسری برسی پر بھی محترمہ جناحؒ کی تقریر کے دوران ریڈیو ٹرانسمیشن میں ''مخصوص جملوں'' کی ادائیگی کے دوران گڑبڑ ہو گئی۔ قدرت اللہ شہاب نے ''صلہ شہید'' میں ایک جگہ رقم کیا: ''مادر ملتؒ کے ذاتی کاغذات میں البتہ ایک مسودہ ضرور ہے'' جس کا عنوان "My Brother" (میرا بھائی) ہے۔ اسے انہوں نے مسٹر جی الانا کے تعاون سے تحریر کیا تھا۔ قائداعظمؒ کی زندگی کے چند گوشوں کا یہ ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن اب تک اس کا پورا متن غالباً کہیں شائع نہیں ہوا۔ قائداعظمؒ کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی تھی،

لیکن یہ منصوبہ بھی بعض سیاسی ''احتیاطوں'' کی نذر ہو گیا۔ مشاہیر کے اقوال اور افعال سے اگر کسی قسم کے تنازع کی صورت نکلتی ہو تو عصری لحاظ سے ایک محدود مدت تک انہیں صیغہء راز میں رکھنا قرین مصلحت ہے۔ لیکن تیس بتیس برس کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ اس عرصے میں متعلقہ مشاہیر تاریخ کی بے رحم بھٹی سے گزر کر اپنے اپنے مسند مقام پر مستحکم ہو چکے ہوتے ہیں۔ جزوی طور پر کسی ناخوشگوار تفصیل کا افشا ان کے اس مقام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ یوں بھی آزاد دنیا میں بہت سی جگہ تیس برس کے بعد خفیہ دستاویزات تک کو عام کر دیا جاتا ہے۔''

اسی طرح ڈاکٹر صفدر محمود نے محترمہ فاطمہ جناحؒ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے کہ محترمہؒ نے ایمبولینس کی خرابی کے واقعہ میں نہ اسے سازش قرار دیا ہے اور نہ ہی کسی کو مطعون کیا ہے، تو اس کتاب کا مکمل مسودہ شائع ہی کب ہوا ہے۔ جناحؒ کی ایمبولینس کی خرابی حادثہ تھی یا سازش؟ اس بحث میں گئے بغیر ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے ہر پاکستانی کی طرح میں بھی متفق ہوں کہ محترمہ فاطمہ جناحؒ واقعی نڈر خاتون تھیں اور یہ ان کا دلیرانہ وصف ہی تو تھا کہ جب وہ خود جمہوریت کی بقا کے لئے آمریت کے خلاف صف آرا ہوئیں۔ اکتوبر 1964ء میں پشاور کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بانگ دہل فرمایا تھا: ''اگر چہ میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ ایسا کر کے میں نے خود کو زبردست خطرے میں ڈال لیا ہے۔ مجھ پر طرح طرح کے الزامات اور اتہام لگائے جائیں گے، حتیٰ کہ مجھ پر قاتلانہ حملے بھی کئے جا سکتے ہیں اور میری جان لینے کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے۔''

آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ یہ محترمہؒ کے خدشات نہ تھے، بلکہ شاید ماضی سے اخذ ہونے والا تجربہ تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے مضمون میں کالم نگار ڈاکٹر مبارک علی صاحب پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مبارک علی صاحب نے قائداعظمؒ کو رگیدنے کے لئے یہ

فتویٰ دیا کہ خود قائداعظمؒ نے کئی بار یہ فتویٰ دیا کہ پاکستان تنہا انہوں نے بنایا اور اس خیال کے ردّ میں ڈاکٹر صفدر صاحب نے یہ فکر پیش کی کہ بحیثیت گورنر جنرل قائداعظمؒ نے اپنی تمام تقاریر میں قیام پاکستان کا سہرا مسلم لیگ کے سر باندھا اور کہیں پر بھی ''میں'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ شک وشبہ سے بالا اس حقیقت میں بھلا رگیدنے والی کون سی بات ہے۔ خود تحریک پاکستان کی سرگرم رہنما اور جناحؒ کی ہر لحہ کی ساتھی محترمہ فاطمہ جناحؒ نے قائداعظمؒ کے ان جذبات کی اپنے الفاظ میں ترجمانی فرمائی ہے۔ ازہر منیر نے ''مادرملتؒ کا جمہوری سفر'' کے عنوان سے محترمہ فاطمہ جناحؒ کی آمریت کے خلاف تقاریر کا مرقع پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ 48 پر محترمہ فاطمہ جناحؒ کی 1955ء میں قوم سے خطاب کا ایک اقتباس یوں ہے:

''انہوں نے پاکستان حاصل کیا اور اسے ترکے میں ہمارے لئے چھوڑ گئے۔''

اس میں شک نہیں کہ قائداعظمؒ نے بحیثیت بانی پاکستان حصول وطن کی خاطر قربانیاں دینے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا، مگر سچ تو یہ ہے کہ عوام نے جان و مال کی قربانی کے لئے لبیک بھی اسی وقت کہا جب جناحؒ نے اس قوم کی قیادت کا بیڑا سنبھالا۔ پھر یہ بات بھی تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ جناحؒ نے مسلم لیگ کے قیام کے سات برس کے طویل عرصہ تک مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہ کی اور اس وقت مسلم لیگ میں شامل ہوئے، جب اس جماعت کا منشور قائداعظمؒ کی امنگوں کی ترجمانی کرنے لگا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کے جسم میں جناحؒ کی حیثیت ایک رُوح کی مانند تھی اور رُوح کے بغیر جسم اپنی مقصدیت کھو دیتا ہے۔ میں نے جس وقت ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کا ثانی الذکر مضمون پڑھا تو تشویش لاحق ہوئی کہ برس ہا برس سے قائداعظمؒ کی ذات سے منسوب چلے آنے والے بیانات وحکایات کی نصف صدی بعد غیر مستند انداز میں نفی، آخر کیوں؟ پھر اس خیال نے بھی جنم لیا کہ ہماری نوجوان نسل اپنے بزرگوں کے بارے میں کیا سوچے گی، جو اُن اقوال کی روایت کرتے چلے آرہے ہیں، جبکہ دوسری طرف تاریخ نے عملاً ان حکایات کی سچائی ثابت

کی ہو کہ قائداعظمؒ اور ان کا ٹائپ رائٹر نہ رہے تو ہم پہلی نصف صدی میں ہی آدھے ملک سے محروم ہو گئے اور کھوٹے سکے اس ملک کے ایوانوں پر ہمیشہ قابض رہے۔

میں نے تحقیق شروع کر دی۔ اسی سچ کی تلاش میں ایک روز تحریک پاکستان کے سرگرم رہنما خاقان بابر کی نیاز مندی کے لئے گیا۔ اظہر علی مظہر کے وہ فرزند جو 1948ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے، جبکہ جنرل سیکرٹری کے لئے شیخ مجیب الرحمٰن کا انتخاب عمل میں آیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ اس وفد میں سردار صادق امرتسری بھی شامل تھے، جنہوں نے خاقان صاحب کو قائداعظمؒ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سے آگاہ کیا۔

سب جانتے ہیں کہ خاقان صاحب کی تحریک پاکستان میں گرانقدر خدمات ہیں۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر صفدر نے تو ان حقائق تک کو روند ڈالا ہے، جن کی بابت تاریخ کے اوراق کسی شک وشبہ کے بغیر ہماری رہنمائی کرر ہے ہیں۔ بیانات وحکایات تو بعد کی بات ہے۔ یاد رہے کہ تاریخ پر مضامین کو خیالوں اور مفروضوں کی روشنیوں میں رقم نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر صاحب! اگر قوم کے لئے ''فرض'' نبھاتے ہوئے حقائق سہواً آپ سے مسخ ہو گئے تو اس ''مرض'' کا علاج کتابوں کے مطالعہ میں ہے اور اگر سہواً ایسا نہیں ہوا تو آپ نے اپنے اوپر تاریخ کا وہ ''قرض'' لے لیا، جس کی ادائیگی ممکن نہ ہو سکے گی۔

روزنامہ خبریں 23- جنوری 2004ء

تمام جرنیلوں اور سیاسی قائدین کے لئے ایک کالم

شاہنواز فاروقی

پاکستان کے حکمراں طبقے نے بھارت سے دشمنی بھی لاشعور کی گود میں بیٹھ کر کی ہے اور اب دوستی بھی لاعلمی کے گہوارے میں بیٹھ کر کی جارہی ہے، جرنیلوں کی تو بات ہی اور ہے ہمارے سیاست دانوں تک نے اس سلسلے میں کسی بہتر فہم کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہم نہ بھارت کو جانتے ہیں نہ ہندوازم سے واقفیت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں تو برہمنوں کی نفسیات کا بھی ادراک نہیں۔

پاکستان میں اب ایسے دانش ور بھی پیدا ہو گئے ہیں جو علامہ اقبال اور قائداعظم کی فکر اور شخصیت کو تقسیم کرنے والی یا Sepratist سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی، اقبال کو دہشت گرد شاعر قرار دے چکے ہیں، قائداعظم کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ عام ہے کہ وہ ایک انانیت زدہ شخص تھے اور ان کی خود پسندی برصغیر کی تقسیم کا سبب بنی۔ ڈاکٹر مبارک نے اپنی ایک تحریر میں قائداعظم سے یہ فقرہ منسوب کیا ہے کہ "پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے"...... حالانکہ یہ بات ہندوؤں کے ایک انگریزی اخبار نے قائداعظم کے بارے میں لکھی تھی۔

حیرت ہے کہ لوگ اقبال اور قائداعظم کے بارے میں یہ تک نہیں دیکھتے کہ ان کا علم کیسا تھا، ان کی شخصیت کیسی تھی، ان کی جدوجہد کیا تھی؟ اقبال کے آباء واجداد برہمن تھے۔

انہوں نے اپنی ایک نظم میں فلسفہ زدہ سیدزادے پر طنز کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔انہوں نے کہا:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
فلسفہ ہے میرے آب و گل میں
پیوستہ ریشہ ہائے دل میں

اس سلسلے میں اقبال کی وسیع المشربی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے رام کو امام ہند کہا ہے۔ کرشن کے فلسفۂ عمل کو سراہا ہے۔گرو نانک کی توصیف کی ہے۔ایسی شخصیت پر دہشت گردی اور تنگ نظری کا الزام لگانے کے لئے جہالت کا سمندر درکار ہے۔لیکن یہ اقبال کی شخصیت کا ایک رُخ ہے اور بہت ثانوی رُخ ہے۔ان کی شخصیت کا بنیادی جوہر اسلام اور اس کی حقیقت پر اصرار ہے۔

قائداعظم کی وسیع المشربی تو مشہور زمانہ ہے، انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز مسلم لیگ سے نہیں کانگریس سے کیا تھا۔گاندھی بیرسٹری کر کے بھارت واپس لوٹے تو قائداعظم نے اُس استقبالیے کی صدارت کی جو گاندھی کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔سروجنی نائیڈو نے لطیفے کے طور پر یہ نہیں کہا تھا کہ جناح ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے سفیر ہیں۔مگر اقبال کی طرح جناح بھی بھارت اور ہندوؤں کی مبادیات سے اس طرح لاعلم نہیں تھے جس طرح پاکستان کا حکمران طبقہ لاعلم ہے۔ہندوؤں کے ساتھ ان کی مشترکہ جدوجہد بھی شعور کا حاصل تھی اور پھر ان سے علیحدگی بھی شعور پر مبنی تھی۔بدقسمتی سے پاکستان کا پورا معاشرہ کچھ مستثنیات کے ساتھ دیگر مذاہب اور دیگر اقوام کے بارے میں لاعلمی کو علم سمجھ کر کام چلا رہا ہے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں پاکستان کے مطالبے اور تحریکِ پاکستان کو

اُس کے پورے سیاق وسباق میں نہ دیکھا گیا اور نہ سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں ہم نے حوالے بھی دیئے تھے سرسید، اقبال اور قائداعظم کے۔ حالانکہ اس سلسلے میں دیگر حوالے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک بہت ہی بڑا حوالہ ڈاکٹر امبید کر کا ہے۔ مگر ڈاکٹر امبید کر کون؟

ڈاکٹر امبید کر کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ بھارت کے چند بڑے قانون دانوں میں سے ایک تھے، بھارت کا آئین انہوں نے ہی تحریر کیا اور اس بنیاد پر انہیں بھارتی آئین کا خالق بھی کہا جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر امبید کر کی دوسری شناخت یہ ہے کہ وہ ''شودر'' تھے اور ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ پیدائش میرے بس میں نہیں تھی اس لئے میں ہندو پیدا ہو گیا، لیکن میں ہندو کی حیثیت سے مرنا پسند نہیں کروں گا۔ اور ڈاکٹر امبید کر نے ایسا کر دکھایا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے بدھ ازم قبول کر لیا اور ان کے زیرِ اثر لاکھوں ''شودر'' بدھ ازم میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اضطراری فعل نہیں تھا، اس کی پشت پر ہزاروں سال کا وہ استحصال تھا جو برہمن شودروں کا مقدر بناتے رہے تھے۔ اقبال اور قائداعظم تو مسلمان تھے مگر ڈاکٹر امبید کر ہندو تھے، اس لئے ان کی بغاوت پاکستان کے مطالبے کی ''بغاوت'' سے زیادہ بڑی بغاوت تھی اور ہم اس بغاوت کو نظر انداز کر کے جدید بھارت کی تاریخ اور برہمنوں کی نفسیات کے بارے میں کوئی بنیادی بات نہیں کہہ سکتے۔

ڈاکٹر امبید کر نے اپنی تصنیف "Pakistan or Partition of India" میں صاف لکھا ہے کہ کانگریس اسی طرح ایک ''ہندو جماعت'' ہے جس طرح (بی جے پی کی سیاسی ماں) ہندو مہاسبھا ایک ہندو جماعت ہے۔ فرق یہ ہے کہ مہاسبھا اپنے اظہار میں ''خام'' اور پُرتشدد ہے اور کانگریس ذرا نرم خو اور سیاست باز ہے، لیکن کانگریس بھی ہندوؤں کی خواہشات کی ترجمانی سے آگے نہیں جا سکتی۔ ہوا بھی یہی۔ کانگریس میں قائداعظم اور بعدازاں مولانا ابوالکلام کے ساتھ کیا ہوا سب کو معلوم ہے، لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ کانگریس نے خود ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا؟ بلاشبہ بدھ ازم ہندو ازم کے

خلاف بغاوت کا شاخسانہ تھا لیکن اس نے رفتہ رفتہ الگ مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جین ازم کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن پنڈت جواہر لعل نہرو نے قیام پاکستان کے فوراً بعد اعلان کیا کہ بدھ ازم اور جین ازم، یہاں تک کہ سکھ مذہب کو بھی ہندو ازم کا حصہ سمجھا جائے۔ اگر چہ برصغیر میں مذہبی سیاست کی ابتداء کا الزام مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے لیکن یہ گاندھی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ''رام راجیہ'' یا ''رام راج'' کی اصطلاح استعمال کر کے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ابھارا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جو برہمن ازم خود ہندو مذہب کے دائرے میں موجود شودروں اور بدھسٹوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکا، وہ کشمیر کے منصفانہ حل اور پاکستان کے ساتھ متوازن تجارت اور ہم سری کے تعلقات پر کیونکر آمادہ ہو گا؟ آخر اس سلسلے میں ہماری فوجی اور سیاسی قیادت کے پاس ان کی امیدوں کی کوئی تو ٹھوس، معقول اور قابل فہم تاریخی، سیاسی اور اخلاقی بنیاد ہو گی؟

برہمن ازم کے خلاف بدھ ازم کی بغاوت انیسویں یا بیسویں صدی کا واقعہ ہے۔ یہ ہندو مسلم کشمکش کے کسی مرحلے پر سامنے آنے والی بغاوت بھی نہیں تھی۔ یہ ہندو ازم کا بدترین زمانہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود برہمن ازم کے خلاف بغاوت ہوئی۔

بدھ ازم کو ابتدا میں صرف اپنی اخلاقی قوت پر انحصار کرنا پڑا لیکن بعد اسے راجہ اشوک کی سرپرستی حاصل ہو گئی جسے خود ہندو ''اشوک میاں'' یا اشوک اعظم کہتے ہیں۔ اشوک کے دور میں بدھ ازم بھارت کے طول و عرض میں پھیل گیا اور اُس وقت بدھ ازم کی طاقت کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہندو ازم کے متوازی قوت بن کر ابھرے گا، لیکن برہمن ازم نے بدھ ازم کو بھارت کی سرزمین پر قدم جمانے نہیں دیئے۔ نتیجہ یہ کہ بھارت میں جنم لینے والا بدھ ازم بعد ازاں بھارت میں کم اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں زیادہ پھیلا۔ یہ ایک اتنی بڑی اور تاریخی شہادت ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بدھ ازم کے بانی گوتم کو نروان حاصل ہوا اور ان کی شخصیت دیکھتے ہی دیکھتے عظمت

حاصل کرگئی، برہمنوں کے لئے انہیں نظر انداز کرنا دشوار تھا چنانچہ انہوں نے گوتم کو اوتار تو مانا لیکن ملیچھ اوتار......یعنی ناپاک اوتار۔اگرچہ ہندوؤں کے ''کاسٹ سسٹم'' کے تناظر میں گوتم کی اس حیثیت کو سمجھا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں جواز کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے، لیکن گوتم کے لئے وضع کی گئی اس اصطلاح میں برہمن ازم کے دل کا چور بھی موجود ہے، اس لئے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوازم کی تاریخ میں اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی کے لئے ملیچھ اوتار کی اصطلاح وضع نہیں کی گئی۔

مسلمانوں میں ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کی تفہیم نہ ہونے کے برابر ہے اور جو ہے وہ غلط ہے۔ ہندوازم میں برہمن، کھشتری، ویشیے اور شودر ''نسلی سلسلے'' نہیں ہیں۔ مہابھارت میں صاف لکھا ہے کہ ایک برہمن کے یہاں شودر اور شودر کے گھر برہمن پیدا ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ذات کا یہ نظام انسانوں کی روحانی استعداد یا ''نفسیاتی قسم'' کی بنیاد پر وضع کیا گیا نظام ہے جسے برہمنوں نے نسلی سلسلے میں ڈھال کر اپنی بالادستی کو دائمی شکل دے دی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ درجہ بندی کا یہ نظام فی نفسہ غلط نہیں لیکن اس کا اطلاق ہولناک حد تک غلط ہوا ہے اور یقیناً یہ اطلاق شعوری طور پر غلط ہوا ہے۔

گاندھی نے شودروں کی بحالی کے لئے بڑی مہم چلائی لیکن انہوں نے درجہ بندی کے نظام کی غلط تعبیر کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہ امر قرین قیاس بھی نہیں ہوسکتا کہ گاندھی مہابھارت میں بیان کی گئی مذکورہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ انہوں نے یہ بات خود نہیں پڑھی ہوگی تو کسی سے سنی ہوگی، لیکن انہوں نے پڑھے کو اَن پڑھا اور سنے کو اَن سنا کردیا۔ کئی ہزار سال کی تاریخ میں کسی برہمن کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ درجہ بندی کے نظام کی اصل معنویت کو آشکار کرتا۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ برہمنوں کو مہابھارت کا مدعا بیان کرتے ہوئے اپنی بالادستی کے خاتمے کا اندیشہ تھا۔ چونکہ ہندوؤں کی تمام مقدس کتب سنسکرت میں تھیں اور سنسکرت ایک طرح سے برہمنوں کی زبان تھی اور

صرف وہی ایک طبقے کی حیثیت سے ان مقدس کتب کی تعبیر کے مجاز تھے اس لئے اس راز کے آشکار ہونے کا امکان کم تھا۔ لیکن اب تو عرصے سے مہابھارت ہندی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس حوالے سے لگتا ہے کہ مہابھارت کی حیثیت ابھی تک ایک بند کتاب کی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق بھارت میں شودروں اور دلتوں کی مجموعی آبادی 30 کروڑ سے زائد ہے اور بھارت کے طول وعرض میں ہر سال ان لوگوں کے خلاف اوسطاً تشدد کے ایک لاکھ واقعات ''رپورٹ'' ہوتے ہیں اور ان واقعات میں بیشتر اعلیٰ ذات کے ہندو ملوث ہوتے ہیں۔

گاندھی جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف مزاحمت کی علامت بن کر ابھرے اور ان کی ابتدائی شہرت اسی مزاحمت کی وجہ سے تھی، انہیں جنوبی افریقہ کے سفید فاموں کی نسل پرستی تو قابلِ مزاحمت لگی لیکن برہمنوں اور دیگر دو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی نسل پرستی انہیں کبھی نظر بھی نہیں آئی۔ بھارت میں 1978ء کو نسل پرستی کے سال کے طور پر منایا گیا، مگر اسی سال مرارجی ڈیسائی کی حکومت نے ایک غیر ملکی ٹی وی چینل کو اچھوتوں پر فلم بنانے سے روک دیا۔ اٹل بہاری واجپائی اس وقت بھارت کے وزیر خارجہ تھے۔ اس حیثیت میں انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کی شدید مذمت کی لیکن دو سال قبل وزیر اعظم کی حیثیت سے انہوں نے اچھوتوں کو جنوبی افریقہ کا ویزا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی اور بھارت کے دلت یعنی اچھوت کانفرنس میں اپنا تجربہ اور مقدمہ پیش کرنا چاہتے تھے۔

آج جو لوگ پاکستان کے مطالبے اور جواز کو چیلنج کرتے ہیں انہیں دراصل بھارت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ آج ہمارے جو جرنیل اور سیاست دان بھارت سے

معاملہ کر رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انہیں بھارت کے سلسلے میں پرائمری کے درجے کی معلومات بھی فراہم نہیں۔

بھارت کے آئین کے خالق ڈاکٹر امبید کر نے بھارت کی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج ہم ''برطانوی سامراج'' سے آزاد ہو کر برہمنوں کے ''زیرِ تسلط'' چلے گئے ہیں۔اس تبصرے کی معنویت کو پھلانگنے کے لئے بھارت کو ابھی صدیاں درکار ہیں لیکن ہمارا حکمران طبقہ اس معنویت کو چار دن کی سارک کانفرنس میں پھلانگ گیا ہے۔

روزنامہ جسارت 23- 24- جنوری 2004ء

قائداعظم اور ڈاکٹر مبارک علی کی وضاحتیں

صفدر جاوید سید

ڈاکٹر مبارک علی نامی ایک ''دانشور'' کا ایک تازہ مضمون چند روز قبل اخبارات میں شائع ہوا اور پڑھنے کو ملا۔ یہ مضمون دراصل ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کے ایک مطبوعہ کالم کے جواب میں ہے، جس کا عنوان تھا ''قائداعظم سے منسوب غلط بیانات وحقائق۔'' گو اصل موضوع سخن کچھ اور ہے مگر ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے مضمون میں کچھ ایسی باتیں تحریر کی ہیں، جو نہ صرف تحریک پاکستان کے اصل پس منظر کی نفی کرتی ہیں، بلکہ بانی پاکستان اور بابائے قوم کی شان میں گستاخی کے مترادف ہیں ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے اس مضمون اور اپنی وضاحتوں میں زور قلم کا اظہار کچھ زیادہ ہی کر دیا ہے اور کچھ ایسی موشگافیاں کی ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا بہت بڑی کوتاہی ہوگی۔ راقم نہ تو مؤرخ ہے نہ دانشور اور نہ ہی محقق۔ اس کے باوجود راقم اس بات کو اپنا فرض سمجھتا ہے کہ مبارک علی صاحب کی نگارشات کا جواب دیا جائے۔ موصوف فرماتے ہیں:

1- ''بھارت میں مورخ تاریخ کو ایک نہیں، کئی نقطہ ہائے نظر سے لکھ رہے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں صرف فرقہ وارانہ نقطہ نظر ہے کہ جس میں ہندو دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں۔ بدقسمتی سے یہ نقطہ نظر نوجوان نسل کو حقائق سے دور لے جا کر انہیں گمراہ کر رہا ہے۔''

2- ''قائداعظم کا مطالعہ ایک تاریخی شخصیت کے طور پر کرنا چاہیئے۔ وہ ایک خاص ماحول، وقت اور حالات کی پیداوار تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب نئے مسائل ہیں۔ نئے چیلنجز ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے نئے خیالات اور نظریات کی ضرورت ہے۔ یہ خیالات اور افکار اسی وقت تخلیق ہوں گے کہ جب ماحول آزاد ہوگا اور کسی نظریہ کی جکڑ میں نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر معاشرہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جائے گا، جیسا کہ اس وقت ہے۔''

جہاں تک مبارک علی صاحب کی متذکرہ پہلی نگارش کا تعلق ہے اور بات چونکہ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے پس منظر میں ہو رہی ہے، مناسب ہوتا اگر موصوف یہ وضاحت بھی فرما دیتے کہ تحریک پاکستان کی تاریخ ہندو دوستی کے کن کن نقطہ ہائے نظر سے لکھی جائے۔ کیا مورخ یہ لکھے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر قیام پاکستان تک غیر منقسم برصغیر میں مسلم ہندو دوستی کا دریا بہہ رہا تھا؟ کیا یہ تحریر ہو کہ اس دور کے تمام ہندو لیڈر مسلمانوں کو اپنا بہترین دوست سمجھتے تھے۔ کیا یہ نقطہ نظر لیا جائے کہ مسلمان اپنے ہندو پڑوسیوں کے گھروں میں یوں داخل ہوتے تھے گویا گھر کا فرد ہوں اور چھوت چھات کا نام و نشان نہیں تھا؟ کیا یہ نظریہ بیان کیا جائے کہ کسی ہندو کے کھانے کو یا کھانے پینے کی چیز کو اگر کسی مسلمان کا ہاتھ چھو جاتا تھا تو وہ ہندو اسے متبرک شے سمجھ کر کھاتا تھا؟ کیا پاکستان کا مورخ یہ تحریر کرے کہ انڈین نیشنل کانگریس دراصل مسلمانوں کی ہی سیاسی پارٹی تھی اور کانگریس کا بنیادی نصب العین مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک کا قیام تھا؟ کیا پاکستان کے مورخ تحریک پاکستان کا پس منظر پھر سے ایجاد کریں؟ اگر کریں تو وہ پس منظر ہندو دوستی کے سیاق و سباق میں کس طرح سے ایجاد کیا جائے؟

اگر موصوف ان باتوں کی وضاحت فرما دیں تو آئندہ نسلوں کے مورخین کی رہنمائی

بھی ہو جائے گی اور یقیناً پاکستان کی نئی نسل ان جدید حقائق کی روشنی میں گمراہ ہونے سے بھی بچ جائے گی۔ اگر ڈاکٹر مبارک علی صاحب مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور سقوط ڈھاکہ کا تاریخی پس منظر بھی کسی نئے زاویے سے بیان کر دیں اور اس سانحہ میں بھارت کے کردار کی بھی نئی وضاحتیں کر دیں تو یہ بھی پاکستان کے آئندہ مورخین اور نئی نسل کے لئے بیحد مفید ہو گا۔ سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد بھارت کی وزیر اعظم صاحبہ نے جو تاریخی بیان جاری کیا تھا، اس کی بھی مبارک علی صاحب کے نقطہ نظر سے وضاحت ہو جائے تو یہ سونے پہ سہاگہ ہوگا۔

اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ بہتر یا اچھے تعلقات کی ضرورت سے کسی ہوشمند پاکستانی کو انکار نہیں اور نہ ہی کوئی ذی ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ بھارت کے ساتھ مسلسل حالت جنگ یا حالت عناد میں رہنا پاکستان کے مفاد میں ہے۔ آج اگر پاکستان کے عوام بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع کرنا چاہیں تو اس خواہش کو کسی طرح بھی نامناسب قرار نہیں دیا جا سکتا، مگر یہ بڑا عجیب استدلال ہے کہ بھارت سے اچھے تعلقات کی خاطر ہم تحریک پاکستان کا اصل پس منظر بھول جائیں اور پاکستان کے مورخین اپنی تاریخ کا یہ باب پھر سے لکھیں اور وہ بھی صرف اور صرف مبارک علی صاحب کی خواہشات کے مطابق۔

ماضی اور تاریخ ماضی ہر قوم کا سرمایہ ہوا کرتی ہیں۔ زندہ اور غیور اقوام وہی ہوتی ہیں، جو اپنے ماضی کو اس کے اصل اور حقیقی پس منظر میں یاد رکھتی ہیں اور اس کے بارے میں معذرت خواہانہ تاویلیں گھڑنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے جب انسان کو وقت کا شعور بخشا تو کچھ اہتمام کے ساتھ کہ ماضی کے لمحوں کو ایک انفرادیت عطا کر دی اور وہ یہ کہ ماضی اور تاریخ ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ہر قوم اور ہر ملک کو اپنے ماضی کے شاندار لمحات اور واقعات پر فخر کرنا چاہئے۔ گو اس کے ساتھ ساتھ ماضی میں کی گئی کوتاہیوں کو مدنظر رکھنا اور ان سے سبق سیکھنا بھی زندہ قوموں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ لیکن تاریخ

ماضی کے ساتھ اس سے بڑی ناانصافی یا اس سے بڑا ظلم نہیں ہوسکتا۔ کوئی مورخ اپنے ذاتی عناد یا ذاتی نقطہ نظر کو ہوا دینے کے لئے خود اپنی تاریخی اساس کو نئے معانی پہنانا شروع کر دے۔ کسی دوسرے ملک کے مورخین کیا کہتے ہیں، یہ بات ہمیں ان پر چھوڑنی چاہئے اور یہ فکر کرنی چاہئے کہ ہماری تاریخ حقیقت کے مطابق رقم ہو۔

اب آتے ہیں مبارک علی کے اس استدلال کی جانب کہ قائداعظم ایک خاص ماحول، وقت اور حالات کی پیداوار تھے اور اب حالات بدل گئے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر کہا جارہا ہے کہ موجودہ دور اور حالات میں قائداعظم کا پاکستان کے عظیم ترین آدمی کی حیثیت سے تشخص تبدیل ہو گیا ہے۔ اب چونکہ مسائل نئے ہیں، لہٰذا قائداعظم کی تاریخی حیثیت ازسرنو متعین ہونی چاہئے۔

راقم ان لوگوں میں سے نہیں، جو قائداعظم کو ایک مذہبی یا عبادت گزار شخصیت بنا کر پیش کرتے ہیں یا ان کے گرد روحانیت کا ہالہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مؤرخین بھی گواہی دیتے ہیں کہ بحیثیت انسان قائداعظم نے کبھی کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی روحانی یا عبادت گزار انسان تھے، لیکن قائداعظم کی اس سے بڑی تضحیک نہیں ہوسکتی کہ وہ ایک خاص ماحول، وقت اور حالات کی پیداوار تھے اور اب حالات بدل گئے ہیں۔ دنیا کا کونسا ایسا عظیم رہنما ہے، جس کی عظمت کا تعین اس دور کے مخصوص حالات میں نہیں ہوا۔ لیکن کیا وہ پس منظر تبدیل ہونے کے بعد ان رہنماؤں کی قوموں نے عظمت کو بھلا دیا؟ صرف بیسویں صدی کو ہی لے لیجئے۔ کیا فرانس میں ڈیگال اور انگلستان میں چرچل کی عظمت اس وقت کے حالات و واقعات کے پس منظر کے بغیر ہے؟ لیکن کیا فرانسیسی دانشور اب ڈاکٹر مبارک علی کی طرح یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اب فرانس میں حالات بدل گئے ہیں اور ڈیگال کی عظمت اور مقام کا تعین ازسرنو ہونا چاہئے؟ کیا انگلستان میں آج کے دور میں دوسری جنگ عظیم کے پس منظر اور حالات کی نسبت سے کوئی تبدیلی نہیں آئی؟ اور

اگر اب حالات یکسر مختلف بلکہ متضاد ہیں تو کیا برطانوی قوم نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ونسٹن چرچل کی عظمت اب دوبارہ ماپنا چاہئے؟

اپنے مضمون کے آخر میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے مجبور اور لاچار قوموں کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس جیفرسن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "مردہ لوگوں کا زندوں پر حکومت کا کوئی حق نہیں ہے۔" یہ قول دہراتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو یہ وضاحت بھی کرنی چاہئے تھی کہ کیا امریکی قوم پر جیفرسن اور ابراہم لنکن جیسے رہنماؤں کے اقوال اور اصولوں کی حکمرانی اب ختم ہوگئی ہے؟ کیا موجودہ دور کے امریکی دانشور، محقق اور مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ اب جیفرسن اور ابراہم لنکن ماضی کا قصہ بن گئے ہیں؟ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ امریکی عوام یا امریکہ کی حکومت نے جب بھی اپنے ان عظیم رہنماؤں کی تعلیمات اور اصولوں سے ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو انہیں ملک کے اندر اور باہر تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

زندہ اور غیرت مند قومیں وہی ہوتی ہیں، جو اپنے اصل اور حقیقی رہنماؤں کے احسان کو فراموش نہیں کرتیں اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی عظمت کو سلام کرتی ہیں۔ قائداعظم چاہے 25 دسمبر کو پیدا ہوئے یا کسی اور تاریخ کو، ان کی پیدائش "جھرک" میں ہوئی یا کراچی میں، ان باتوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے نام نامی میں "جناح" کا لفظ اگر ابتداء میں "جینا" تھا تو یہ بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی وضاحت بقول مبارک علی بہت ضروری ہے۔ اصل بات جسے اس ملک کی آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ محمد علی نام کا یہ بچہ بڑا ہو کر ہمارے ملک کا سب سے عظیم رہنما اور قائداعظم کیونکر بنا۔ نوجوان نسل کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری ہے کہ تحریک پاکستان کے کڑے دور میں تخت برطانیہ، برطانوی وائسرائے، ہندو قوم، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور دیگر کئی شخصیتیں اس ایک دھڑے میں جمع تھیں، جو برصغیر کی تقسیم کے بغیر اس کی آزادی کا خواہاں تھا۔ اور دوسری جانب مسلمانوں کی ترجمانی قائداعظم کر رہے تھے اور اس دوسرے دھڑے کا اصرار

تھا کہ برصغیر آزاد تو ہو، مگر دو ملکوں کی صورت میں۔

تاریخ گواہ ہے اور مبارک علی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جیت بالآخر دوسرے گروپ اور اس کے عظیم رہنما کی ہوئی۔ غور کی ضرورت اگر ہے تو ٹامس جیفرسن کے متذکرہ قول پر نہیں، بلکہ اس بات پر کہ اتنی متحد اور طاقتور حزب مخالف کے باوجود مسلمانوں اور ان کے عظیم رہنما، یعنی قائداعظم کی جیت آخر کیونکر ہوئی اور پاکستان کا قیام کیونکر ممکن ہوا؟ ڈاکٹر مبارک علی صاحب اگر تاریخ کی اس لازوال حقیقت پر غور کریں تو یہ اس ملک اور اس کی نوجوان نسل پر ان کا احسان ہوگا۔ ایک طرف بھارت والے ہیں، جنہوں نے موہن داس کرم چند گاندھی کو مہاتما بنا دیا اور دوسری طرف ہم ہیں کہ ہمارے درمیان ڈاکٹر مبارک علی جیسے دانشور ٹامس جیفرسن کے ایک قول کا سیاق وسباق کے بغیر حوالہ دے کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اپنی طبعی موت کے بعد قائداعظم کا اس ملک پر کوئی استحقاق نہیں۔

جو ملک یا معاشرہ اپنے بنیادی نظریہ اور اساس کو فراموش کر دے، وہ ایک ملک یا معاشرے کے بجائے بھیڑ بکریوں کا باڑہ بن جاتا ہے اور خدا نہ کرے اس ارض پاکستان کو کبھی وہ دن یا وہ صورتحال دیکھنی پڑے۔

روزنامہ خبریں 6- فروری 2004ء

ڈاکٹر مبارک علی کا تاریخی کارنامہ!

افضال ریحان

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی فرد ہو یا قوم، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ ہمیں ماضی سے نکل کر محض حال کی بات کرنی چاہئے، افراد کے لئے تو شاید اس کی کچھ گنجائش ہو، لیکن اقوام کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تینوں ادوار آپس میں گہرے مربوط اور باہم پیوست ہوتے ہیں۔ بہر حال زندہ اقوام کی یہ خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ ماضی کے تجربات سے روشنی لیتے ہوئے اپنا حال اس طرح بہتر بناتی ہیں کہ نظر مستقبل کے ٹارگٹ پر رہتی ہے، جبکہ پسماندہ اقوام کی نظر ماضی کی طرف اور پیٹھ مستقبل کی جانب ہوتی ہے۔

وہ یا تو ماضی کے معاملات و مسائل پر الجھتی اور جھگڑتی رہتی ہیں یا اسے افسانوی رنگ دے کر اس پر اتراتی اور داد و تحسین کے ڈنکے بجاتی رہتی ہیں، جس کی آؤٹ پٹ سوائے قومی تفاخر کے اور نتیجتاً اقوام دیگر سے آویزش کے اور کچھ نہیں ہوتی۔

ایسی اقوام اپنی نئی نسلوں کے لئے تاریخ بناتی ہوں یا نہ بناتی ہوں، البتہ تاریخ بگاڑتی ضرور ہیں، جس میں حسب ذوق و ضرورت من پسند نمک مصالحے خوب لگائے جاتے ہیں۔ قومی ذوق کی مطابقت میں جو شخص اس مصالحے بازی کے فن میں زیادہ مہارت رکھتا ہے، وہ اس قوم کا بڑا محقق تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جو حقائق کو حقائق مانتے ہوئے، اس ہیرا پھیری کی

بجائے اصلیت سامنے لاکر اپنی قوم کو سچائی کے آئینے میں اصل چہرہ دکھاتا ہے، وہ ناپسندیدہ وقابلِ ملامت قرار پاتا ہے۔ کسی کی خواہشات اور آرزوؤں سے حقائق مسخ تو کئے جاسکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں، جب بھی تاریخ کا کوئی محقق تحقیق کی بازی لگائے گا تو وہ انہیں حاضر وموجود پائے گا۔

اگر جذباتیت سے ہٹ کر حقیقی کارکردگی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو وطن عزیز میں اس نوع کا تاریخی محقق ہمیں ڈاکٹر مبارک علی کے نام کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، جنہوں نے تاریخ نگاری میں حقائق کو جانچنے کے لئے سائنٹیفک اسلوب کو ہی اپنا رہنما اصول بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں تاریخ نویسی تین قسم کی روایات پر مبنی ہے، ایک وہ جو صوفیاء کے کشف و کرامات کے زیر اثر لکھی جاتی ہے، اس کے ابتدائی نمونے ہم ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں بھی دیکھتے ہیں، جب مریدوں نے اپنے مرشدوں کی تاریخ لکھی تو ہر کارنامہ ان سے منسوب کر دیا۔ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور بعد میں آنے والے سلاطین کی تمام فتوحات اس قسم کی تاریخ میں ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں...... ان تاریخوں میں خواب بھی ہیں، غیبی اشارے بھی ہیں اور پیروں کی روحانی طاقت وقوت کا اظہار بھی۔ دوسری قسم کی تاریخ وہ ہے جو داستانوں، افسانوں اور شاعری کی صورت میں ہے۔ اس میں شاعر و افسانہ نگار اپنے تخیل کی مدد سے حقائق کو افسانوی بنا کر لوگوں کے لئے دلکشی کا باعث بنا دیتے ہیں...... اس میتھ میں اس قدر جاذبیت ہوتی ہے کہ لوگ اصل حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے ہیں۔ تاریخ کی تیسری قسم وہ ہے، جسے سائنس کہا جاتا ہے۔ اس میں اول واقعات کا تعین کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا شہادت اس واقعہ سے کوئی مطابقت رکھتی ہے یا نہیں"......

پس ماندہ معاشروں کی تاریخ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''پس ماندہ معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ ان کے ہاں نظریات و افکار اور خیالات سے زیادہ شخصیات پر زور دیا جاتا ہے اور انہیں اس قدر مقدس و متبرک بنالیا جاتا ہے کہ ان کا کہا ہوا ہر لفظ درست تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخصیت اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے نام سے منسوب کر کے یا اس کے بیانات و خیالات کو مسخ کر کے سیاستدان اور رہنما اس سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہی صورت پاکستان میں قائداعظم کی ہے، جنہیں دائیں اور بائیں بازو کے لوگ اپنے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ دونوں ان کی تقریروں اور بیانات سے اپنے مطلب کی باتیں ڈھونڈ لاتے ہیں، جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شخصیت سے علیحدہ ہو کر نظریات و افکار کی بنیاد پر لوگوں کے ذہنوں کو بدلا جائے، کیونکہ شخصیت ایک عہد اور وقت کی پیداوار ہوتی ہے، جبکہ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نظریات و افکار بھی وقت کے تقاضوں کے تحت تشکیل ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اگر کوئی ایک شخصیت معاشرے کے ذہن و دماغ پر چھا جائے تو پھر نئے خیالات تخلیق نہیں ہوتے اور معاشرہ محض تقلید کی راہ اختیار کرلیتا ہے۔''

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ بالا نتیجہء فکر سے اس وجہ سے بھی اتفاق ہے کہ ہمارے سماج میں شخصیات کے بت خانے کی ریت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک بت اگر پرانا ہو کر ذرا فاصلہ پکڑتا ہے تو بہت سی دیگر ''ہستیاں'' اس انتظار میں بیٹھی ہوتی ہیں، بلکہ ان کی زندگی بھر کی کاوشوں کا محور ہی یہ اپروچ رہتی ہے کہ انہیں بھی قوم میں ایک بڑے بت کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اپنی شخصیت بنانے اور منوانے کا داعیہ و چسکہ یہاں ہر نظریے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ان دیکھی الوہی وحدت کے دعویداروں نے بت تراشی کے فن میں ہر قوم کو مات دے دی ہے۔

مغرب کی ترقی پر ہزار تنقیدوں کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی سوسائٹی سے ایسے ہر بت کو پاش پاش کر دیا ہے، اپنی پوری تاریخ میں کوئی بھی شخصیت تنقید

سے بالاتر نہیں رہنے دی، حتیٰ کہ Jesus Christ جیسی ہستی کی الوہیت کو بھی کھلے عام چیلنج کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ شخصیات کا احترام اپنی جگہ، لیکن تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے وہ کچھ کہا جاتا ہے، جس کا ہمارے ہاں تصور کرتے ہوئے بھی روح کانپنے لگتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وحدت کا سب سے بڑا پرچارک اس وقت مغرب بن چکا ہے جو کسی الوہی شخصیت پر نہیں، الوہی نظریے پر ایمان لا چکا ہے۔ خدائی وحدت کا عکس انسانی وحدت کی صورت میں سامنے لا رہا ہے، اگرچہ ہنوز اس کے اہداف محدود ہیں، لیکن آزادیء اظہار اور حرمتِ فکر نے نظریاتی اذہان سے شخصی بتوں کا صفایا کرتے ہوئے عظمتِ انسانی کو منوالیا ہے، جبکہ اپنی حالت یہ ہے کہ ہم آج بھی تاریخ پر لڑ رہے ہیں۔ فلاں ہستی کا یہ رتبہ تھا اور میں فلاں کا پیروکار ہوں، تم تاریخ کی فلاں بڑی ہستی کے دشمن ہو، اس لئے میں تمہارا دشمن ہوں، تمہیں برداشت نہیں کر سکتا، تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم ''جمل'' اور ''صفین'' کے معرکے آج بھی اپنی مساجد اور امام بارگاہوں میں لڑ رہے ہیں۔ گزرے ہوئے مختلف کرداروں کے لئے زندہ انسانوں کو مار رہے ہیں۔ مظلوم دکھی عورتوں کو بیوگی اور معصوم بچوں کو یتیمی بانٹ رہے ہیں یا پھر مخصوص ادوار کے نظریات کو بزور منوانے کے لئے پوری دنیا کا سکون برباد کئے ہوئے ہیں۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ہمیں موجودہ تمام فتنوں اور فسادات کی جڑیں ماضی کی اس تاریخ میں ملیں گی، جو ہم نے اپنے مخصوص مقاصد کے تحت بڑی افسانوی بنا رکھی ہے، جس پر کئی ناول و افسانہ نگاروں، عالمی ذاکروں اور شاعروں نے جذباتیت کے تہہ در تہہ ردے چڑھا رکھے ہیں اور مرچ مصالحے سے حقائق کو کیا سے کیا بنا رکھا ہے۔

اگر آج بھی ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھائیں گے کہ مہاتما گاندھی مکار تھا اور ہندو بحیثیت قوم دھوکے باز ہیں، تو پھر ہم اپنی نئی نسلوں کو کون سی رواداری و انسان نوازی سکھا رہے ہوں گے؟ اور یہ تاریخ کی کون سی خدمت ہے؟ ظاہر ہے جب کسی خطے میں دو مخصوص

اقوام کے مفادات کا حریفانہ ٹکراؤ ہوگا تو اس میں اپنی اپنی بہتری کے لئے سیاسی چالیں بھی چلی جائیں گی۔

خود مسلمانوں کے اندر عربوں اور ترکوں یا عربوں اور عجمیوں (ایرانیوں) کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوا؟ تو کیا دوسری قوم کو ابدی طور پر دھوکے باز قرار دے دیا جائے، جبکہ نہلے پر دہلے تو ہر قوم میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور روادار انسانوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ کیا مہاتما گاندھی وہی ہندو رہنما نہیں ہیں، جنہوں نے پاکستان اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دی، اس کے باوجود ہمارے بچوں کو یہاں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گاندھی جی مکار تھے، بلکہ ''جی'' لکھنا بھی ہماری طبع ء نازک پر گراں گزرتا ہے۔

اس اصول پر دنیا بھر کی باہم حریف اقوام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو کر ہمارے سامنے آئے گی کہ محض سیاسی و مذہبی مفادات و اختلافات کے کارن اکثر و بیشتر تاریخ کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسطینی بچوں کو پہلی کلاس سے ہی جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس کے مطابق یہودی دنیا کی ذلیل ترین اور خداوند کی ہمیشہ کے لئے مغضوب قوم ہیں۔ پہلے دن سے جن کے کھاتے میں نیکی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

جب تاریخ کی کتابوں کو اپنے مخصوص مقاصد کے رنگ میں رنگتے ہوئے اپنے بچوں کے معصوم ذہنوں میں اتارا جائے گا تو وہ اذہان کبھی نارمل انداز میں بالمقابل قوم کی خوبیوں اور خامیوں کا سائنٹیفک جائزہ نہیں لے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ عمل دوطرفہ ہے، بالمقابل بھی یہی کارنامے سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً امریکہ جیسی طاقت کا اقوام عالم کی معاونت میں دیا ہوا روڈ میپ بھی سپیڈ پکڑنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور بزور کروائی گئی ایسی کسی کامیابی کے بعد آگے چل کر یہ ابدی نفرت نامعلوم کون سا روپ دھار لے؟...... لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تاریخ کو مسخ کرنا چھوڑ دیں۔ ہر قوم کے ساتھ جہاں ماضی کی

تلخیاں ہوتی ہیں، وہاں کچھ شیرینیاں بھی ہوتی ہیں، کچھ امن کے معاہدے اور دوستی کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں ہمہ وقت گندی مکھی کی بجائے کبھی شہد کی مکھی جیسا طرز عمل بھی اپنا کر دیکھ لینا چاہئے۔ اس سے آؤٹ پٹ خود بخود میٹھی ہو جائے گی۔ پھر ہر وقت ماضی میں جھانکنے کی بجائے کبھی مستقبل کی جانب بھی اپنی منزل تلاش کرنے کے لئے دیکھنا چاہئے، کیونکہ منزل ماضی میں نہیں، ہمیشہ مستقبل میں ہوتی ہے۔ ہماری نظر میں ڈاکٹر مبارک علی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جنوبی ایشیا کی تاریخ کو بگاڑنے یا سنوارنے کی بجائے، جیسی وہ ہے، بلاکم وکاست، بغیر کسی قطع و برید، کاٹ چھانٹ یا ملمع کاری کے نئی نسل کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس خطے کی تاریخ کو مسخ ہونے سے بچایا ہے اور ہماری یہ آرزو ہے کہ وہ مختلف متنوع ادوار کی اسلامی تاریخ کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ ءنظر کے ساتھ نوجوان نسل کے سامنے لائیں۔ موجود تو سب کچھ ہے، اصل مسئلہ خالص اور نایاب موتیوں کو کھنگال کر اپنی اصلی حالت میں سامنے لانا ہے۔

مجھے ان کے اس نقطہ ءنظر سے بھی پوری طرح اتفاق ہے کہ ہم نے قائداعظمؒ کی شخصیت کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر تحریف کے زور سے مسخ کر کے قوم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسے معلوم نہیں کہ قائد انگریزی زبان بولتے تھے، انگریزی لباس پہنتے تھے، مغربی اطوار و اسلوب رکھتے تھے اور روایتی معنوں میں کوئی مذہبی شخصیت نہ تھے، لیکن ہم اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا وہ سوتے بھی شیروانی میں تھے اور ان کے ماتھے پر ہی نہیں مصلے پر بھی محراب پڑ گئی تھی۔ قائد تو اتنے سچے اور کھرے انسان تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی سیاسی مفادات کے لئے بھی پارسائی کے دعوے نہیں کئے۔

قائد کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ’’قائداعظم کی شخصیت کا جس نے بھی بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو جانتا ہے کہ وہ ایک

ایماندار، دیانت دار اور بحیثیت وکیل پروفیشنل آدمی تھے وہ قطعی مذہبی نہیں تھے یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی مذہبی پابندیوں کا خیال نہیں رکھتے تھے۔...... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جاگیرداروں، زمینداروں اور پیروں کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے چونکہ ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا اس لئے ایسے تمام افراد کہ جو اپنی خاندانی وراثت پر ناز کرتے تھے ان کے لئے ان کے دل میں کوئی زیادہ جگہ نہ تھی سندھ کے گورنر سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہزار روپے میں کسی بھی جاگیردار کو خرید سکتے ہیں اس پر گورنر کا کہنا تھا کہ یہ قیمت زیادہ ہے اور وہ محض پانچ سو روپے میں یہ سودا کر سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپوزیشن کو قطعی برداشت نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کے اردگرد جو لوگ تھے، وہ ان کے رعب میں رہتے ہوئے اکثر خاموشی ہی اختیار کرتے تھے۔ اسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد ہر ایک نے یہی کہا کہ پاکستان محض ان کی ذہانت اور وکالت کی بناء پر بنا۔ پاکستان بننے کے بعد جب وہ گورنر جنرل بنے تو انہوں نے اس کا صاف طور پر اظہار کیا کہ وہ برائے نام گورنر جنرل نہیں رہنا چاہتے، اس لئے 1935ء کے ایکٹ میں تبدیلی کر کے ان کے اختیارات کو وسیع کیا گیا اور انہی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے سرحد کی صوبائی حکومت کو توڑا اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اسی کے تحت سندھ میں کھوڑو کو چیف منسٹری سے معزول کر دیا۔ وہ گورنر جنرل بھی تھے اور دستور ساز اسمبلی کے صدر اور مسلم لیگ کے سربراہ بھی...... کچھ لوگوں نے تو انہیں ''شہنشاہ پاکستان'' کہنا بھی شروع کر دیا تھا اور کراچی میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور انہیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹر صفدر محمود سے ہونے والی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ قائد نے یہ کہا تھا یا نہیں کہ ''پاکستان انہوں نے اور ان کے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا'' یا یہ کہ ''ان کی جیب میں چند کھوٹے سکے ہیں''۔ علمی نقطہ نظر سے دونوں صاحبان نے جو کچھ لکھا ہے، وہ

ہمارے قومی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بحث کو پڑھ سکتا ہے، البتہ عوامی سطح پر ہم نے ان دونوں فقروں کو زبان زدِ عام و خاص پایا ہے، بالخصوص ایوانِ کارکنانِ تحریک پاکستان کی مختلف تقاریب میں ہم نے تحریکِ پاکستان کے جن کارکنان کو برسوں سنا ہے، وہ اپنے خطاب میں ان ہر دو فقروں کا استعمال بہتات کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ کوئی کارآمد موضوع نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شخصیات کو مسخ کرنے کی بجائے واقعات و حقائق کے تناظر میں پرکھا اور سمجھا جائے اور شخصیات سے زیادہ نظریات پر غور فرمایا جائے۔

روزنامہ پاکستان 11-12-فروری 2004ء

سستی جذباتیت

قمرالزمان بودلہ
طالبعلم ایم فل
جی سی یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر صفدر محمود صاحب جو تحریک پاکستان کے محافظ، نظریہ پاکستان (گو بعد کی اصطلاح ہے) دو قومی نظریے کو (جو پاکستان سے کئی گنا زیادہ مسلمانوں کو ہندوستان میں چھوڑ کر آنے سے ہی متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اس سوال کا جواب آج بھی یہ لوگ نہیں دے سکے کہ بھائی مسلم ریاست پاکستان تھی تو ہندو ریاست ہندوستان پھر آپ وہاں مسلمان اس کثیر تعداد میں کیوں چھوڑ آئے ہو؟) حصہ ایمان سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے سارے ذرائع ان کے سپرد کر دیں اور اپنے دیگر ساتھیوں (زیڈ۔ اے سلہری مرحوم وغیرہ) کی طرح پاکستان اور مسٹر جناح کو کیش کروائیں۔ اور اگر کوئی حقائق سے پردہ اُٹھائے ان کے چہرے بے نقاب کرے تو لٹھ لے کر اُس کے پیچھے پڑ جائیں۔ اس طرح کی ذہنیت ہمارے ہاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے میں زندگی بھر نہیں ملا، مگر اُن کو تھوڑا بہت پڑھا ضرور ہے۔ بحیثیت اُستاد کے وہ میرے لئے باعث عزت و افتخار ہیں۔ ان سے عقلی رویوں کا فروغ حاصل ہوا اور مفاد پرستانہ سستی جذباتیت سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ بس اتنا سا تعلق

اس شخص سے قائم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ پر اس شخص کا احسان عظیم ہے کہ اس نے آج کے پاکستان کی عوام کو لاحق، مفاد پرستی، جھوٹی انا، فرقہ واریت اور راتوں رات طاقتور سے مل کر محسن کشی کرنا، جیسی بیماریوں کی نہ صرف تشخیص کی ہے۔ بلکہ علاج بھی تجویز فرمایا ہے۔ اور اللہ ڈاکٹر صفدر محمود جیسے لوگوں کو یہ ''دوا'' تلاش کرنے کی توفیق عطا فرمائے نہ کہ یہ ہمہ یاراں ان بیماریوں کے بڑھاوے کے لئے سازگار ماحول مہیا فرماتے رہیں اور یوں نئی نسل جس کو بچانے کی ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے بات کی ہے، کا بیڑا (اللہ نہ کرے) غرق کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔

میری ان جیسے عالموں اور مفکروں سے گزارش ہے کہ پاکستان کے بننے سے آج تک آپ نے سچ کا سودا کیا ہے۔ اور مجھے علم ہے کہ آپ سچ پر عمل کرنا اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں، مگر خدارا ہمیں سچ سننے اور پڑھنے سے تو منع نہ فرمائیں، اور اپنی آخرت کا بیڑا غرق نہ کریں۔

مجھ جیسا کم علم شخص اس موضوع پر قطعی خامہ فرسائی نہ کرتا۔ اگر بات صرف جناب ڈاکٹر صفدر محمود صاحب اور جناب ڈاکٹر مبارک علی صاحب کے درمیان ہی کالمی اور علمی و فکری سطح پر جاری رہتی۔ مگر ستم یہ کہ اس میں ''صفدر جاوید سید'' جیسے ''بڑے قد'' کے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ چنانچہ اس جنگ میں جو وہ برسوں سے لڑ رہے ہیں۔ آج تنہا چھوڑنا بہت برا محسوس ہوا۔ اور مجھ سے نہیں رہا گیا۔

میری تو صفدر جاوید سید صاحب سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آنکھیں بند کر لینے سے دن کو رات میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے خدا کے لئے 2004ء میں تو باز آجائیں۔ آپ کسی دانشور یا اُستاد کو عزت اور محبت تو خیر کیا دیں گے کم از کم کچوکے لگانے سے تو باز آجائیں۔ آپ ان کی عزت کروا تو خیر کیا سکتے ہیں، خود ہی کرلیں۔ میں یہ اجتماعی سماجی رویوں کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں میری مُراد خالصتاً صفدر جاوید سید صاحب کی ذات نہیں ہے۔ وہ

میرے لئے نہایت قابلِ احترام ہیں۔

مورخہ 10-02-2004 کے روزنامہ نوائے وقت میں بعنوان ''قائداعظم اورڈاکٹر مبارک علی کی وضاحتیں'' کے عنوان سے صفدر جاوید سید صاحب کا مضمون نظر سے گزرا، تو یقین مانئے تکلیف ہوئی۔ اُس اندازِ تحریر سے جواُنہوں نے اختیار فرمایا ہے۔ جس میں کہیں موصوف اور کہیں مبارک علی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس نفرت انگیز انداز میں مضمون شروع کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے گا......

''ڈاکٹر مبارک علی نامی ایک ''دانش ور'' کا ایک تازہ مضمون چند روز قبل اخبارات میں شائع ہوااور پڑھنے کا موقع ملا......''

میری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ اُنہیں بالکل غلط قرار دے دیں مگر وہ اُستاد بھی ہیں اور دانشور بھی اُن کی ان حیثیتوں سے تو آپ کو انکار نہیں ہونا چاہئے۔ کم از کم مخاطب تو عزت سے کریں۔ جیسا کہ میں آپ کے لئے کررہا ہوں۔ ہمارے معاشرے میں دانشور یا اُستاد کو کبھی بھی عزت نہیں دی گئی اُس کے پیشے کو گھٹیااور کمتر جانا گیا ہے۔ یہ سب نہ سہی اُسے (ڈاکٹر مبارک علی صاحب) انسان ہی تسلیم کرلیا جائے۔ تب بھی اُن کی عزت فرض ہو جاتی ہے۔ آپ ان کی بات درست تسلیم نہ فرمائیں مگر سُننے تو دیں۔ آپ نہ مانیں، بُرا بھلا تو نہ کہیں۔ مجھے علم ہے کہ میری اتنی سی جسارت بھی بہت سے نازک مزاج لوگوں کو گراں گزرے گی اور اس پاداش میں مجھے بھی سزاوار ٹھہرایا جائے گا مگر جہاں اُستاد محترم جناب مبارک علی صاحب سے اتنا کچھ ہورہا ہے میری کیا بساط ہے۔ مگر میں جناب صفدر جاوید سید صاحب سے اتنی درخواست کروں گا کہ بھینسوں کی لڑائی میں ہم جیسے مینڈک بلاوجہ مارے جاتے ہیں۔ جو ''بیچارے'' ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قائداعظم کی حیثیت کم کی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہیرو بھی بقول مشرف صاحب انسان ہی ہیں۔ اور اگر تاریخ میں اُن

سے کوتاہیاں سرزد ہوں تو مان لینے میں کچھ حرج نہیں ہے۔اس سے مستقبل کے بہتر ہونے کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔

جہاں تک ہیرو کی نفی کا سوال ہے تو ڈاکٹر قدیر بھی تو ہیرو ہے، اگر ایک نے پاکستان بنایا ہے تو دوسرے نے ''بچا کھچا'' بچایا ہے۔ان کے ساتھ بھی صفدر جاوید سید صاحب کے نزدیک یقیناً زیادتی ہوئی ہوگی ۔مگر اتنے بڑے واقعے پر انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔شاید مسلم لیگی مزاج ہی یہی ہے کہ راتوں رات مفاد کے لئے تبدیل ہونا یا تاریخی حقائق کو مسخ کرنا۔

آج جب ہندوستان سے محبت و دوستی کی پینگیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اور مقتدر قوتیں سب کچھ کرنے پر تیار ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ حل ہو گیا ہے کہ LOC کو مستقل کر دیا جائے ،مشرقی پنجاب کا وزیر اعلیٰ پنجابی کانفرنس میں لاہور شرکت کر رہا ہے۔ہم ہمیشہ لڑ نہیں سکتے۔واجپائی کی عزتیں ہو رہی ہیں۔تو ڈاکٹر صفدر محمود صاحب یا صفدر جاوید سید صاحب نے کوئی کالم نہیں لکھا،صرف اسی وجہ سے کہ یہ سب قوم کی اُمنگوں کے مطابق کرنے والے صدر صاحب خود ہیں۔مگر یہ ہم جیسے شریف لوگوں پر تو لٹھ لے کر چڑھ دوڑتے ہیں۔

اور مجھے یقین ہے کہ کل جب پاکستان اور بھارت کنفڈریشن بن جائیں گے تو تب اسی مزاج کے حامل لوگ سب سے آگے پہنچ کر بیان دے رہے ہوں گے کہ جناب ہم ہی تو تھے جنہوں نے اس کے لئے زمین ہموار کی تھی۔

اسی کالم میں طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں،''...... اگر موصوف (ڈاکٹر مبارک علی صاحب) یہ وضاحت بھی فرما دیتے کہ تحریک پاکستان کی تاریخ ہندو دوستی کے کن کن نقطہ ہائے نظر سے لکھی جائے......''

میں تو اس پر اتنا عرض کروں گا کہ یہ سوال آپ ''رائٹر'' کے نمائندے کی طرح کسی پریس کانفرنس میں جناب پرویز مشرف صاحب سے ہی پوچھ لیں تو نہایت مناسب جواب مل جائے گا۔کیونکہ آج کل اُن کا نقطہ نظر بھی اتفاق سے مسلم لیگ کے بجا۔ ے ڈاکٹر صاحب

(ڈاکٹر مبارک علی صاحب) سے زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔ ''سب سے پہلے پاکستان''
تکلیف ملک وقوم اور ہندو دشمنی تو ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کی معاشیات کے لئے بھی ضروری ہے۔ مگر میں حیران ہوں کہ اُن کی خاموشی سے سبق حاصل کرنے کی بجائے آپ بلاوجہ میدان قلم میں کیوں اُتر پڑے۔ خیر یہ آپ جانیں اور آپ کے مسائل۔ ہم جیسوں کو کیا لینا دینا خیر میں نہیں چاہتا تھا کہ ہر شخص ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو ہی نشانہ بنالے چنانچہ ایک دوسرے نشانے کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیا ہے۔

معزز قارئین سے درخواست ہے کہ ''صفدر جاوید سید'' صاحب جہاں ایک طرف تو ہندو دشمنی کو ضروری تصور فرماتے ہیں۔ وہاں اسی مضمون میں اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہیں اور ان کی شخصیت کا یہی دُہرا پن آپ کو دکھانا مقصود تھا۔

آپ فرماتے ہیں ''...... آج اگر پاکستان کے عوام ہندوستان کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا نیا دور شروع کرنا چاہیں تو اس خواہش کو کسی طرح بھی نامناسب قرار نہیں دیا جا سکتا......''

میری ان سے استدعا ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو بُرا بھلا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر براہ کرم اگر ان کی تصانیف کو پڑھ لیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ سچ تک پہنچ جائیں گے ویسے ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ پاکستان کی حکومت نے درسی کُتب ایک خاص نقطہ نظر سے لکھوائی تھیں اور اُن کو پڑھ کر سامنے آنے والی نسل فکری اور علمی سطح پر ایسے مغالطوں کا شکار ہے۔ اگر مجھ سے ان کی شان میں نادانستگی کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔

اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے اندر جو جذبہ، لگن اور تڑپ موجود ہے، خوشی ہوگی اگر واضح سمت کا تعین فرمالیں گے تو۔

قائداعظم اور ڈاکٹر مبارک علی

پروفیسر ریاض صدیقی

کچھ روز پہلے صفدر جاوید سید نے ڈاکٹر مبارک علی کو نشانہ بنایا ہے۔

مورخ کے جو اقتباسات معترض نے نقل کیے ہیں یہ ہیں۔

''ہندوستان میں مورخ تاریخ کو ایک نہیں کئی نقطہ ہائے نظر سے لکھ رہے ہیں۔ پاکستان میں صرف فرقہ وارانہ نقطہ نظر ہے کہ جس میں ہندو دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ نقطہ نظر نوجوان نسل کو حقائق سے دور لے جا کر انہیں گمراہ کر رہا ہے۔'' اس پر اعتراض کے حق سے انکار نہیں مگر جب کوئی پڑھا لکھا باشعور اعتراض اٹھاتا ہے تو حوالوں، دلائل اور اسباب کی مدد سے اپنے اعتراض کو جواز فراہم کرتا ہے۔ صفدر جاوید صاحب نے حوالوں، دلائل اور اسباب کے بغیر ڈاکٹر مبارک کے خلاف کفر و اسلام کی لڑائی شروع کر دی ہے۔ یہ تو اتنا پھیلا ہوا اور گمبھیر موضوع ہے جس کا جائزہ ماضی کی پوری تاریخ کے تناظر میں ہی لیا جا سکتا ہے تاکہ معترض کو یہ حقیقت بتائی جا سکے کہ مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ راج پاٹ کے دوران ہندوستان کے اسی فیصد ہندوؤں جو اپنے دھرامک معاملات میں ہمیشہ ہی گرار ہے تھے اور مسلمانوں کے درمیان عقائد اور زبانوں کی بنیاد پر کوئی فرقہ وارانہ ملک گیر ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ ہندوؤں و مسلمانوں اور ہندی و اردو کے درمیان نفرت اور دشمنی کی فضا 1800ء سے لے کر 1867ء تک ہندوستان پر حکمران نوآبادیاتی سامراجیت نے بنائی تھی۔ ہندوستان پر حکمران

نوآبادیاتی سامراجیت نے بنائی تھی۔ ہندوستان کے مورخوں کے بارے میں ڈاکٹر مبارک کی رائے معترض کو بہت بری لگی جبکہ یہ کھرا سچ ہے کہ امریکہ، یورپی ملکوں اور ہندوستان میں مورخ تاریخ کو مختلف نقطہ نظر سے لکھ رہے ہیں۔ ان ملکوں کے مورخ اور دانشور اپنے ہیروز پر تنقید کرتے ہیں۔

انہوں نے طنزاً یہ جملہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طرف پھینکا ہے کہ کیا کانگریس کا نصب العین مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک کا قیام تھا؟ اس طرح اندر چھپی ہوئی سچائی تو انہوں نے خود ہی لکھ دی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان تو کانگریس ہی نے بنوایا تھا اور 1946ء میں تو کانگریسی نیتاؤں نے ہندوستان کے بٹوارے کے موقف کو مان بھی لیا تھا تا کہ اٹھائیس کروڑ مسلمانوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اسی فیصد ہندوستان میں بچے کھچے پندرہ کروڑ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر سکیں اور ان کا قتل ہوتا رہے۔

ڈاکٹر مبارک نے لکھا ہے کہ ''قائداعظم کا مطالعہ ایک تاریخی شخصیت کے طور پر کرنا چاہئے۔ وہ ایک خاص ماحول، وقت اور حالات کی پیداوار تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں، نئے مسائل ہیں، نئے چیلنجز ہیں ان سے نمٹنے کے لئے نئے خیالات اور نظریات کی ضرورت ہے۔ یہ خیالات اور افکار اسی وقت تخلیق ہوں گے جب ماحول آزاد ہوگا۔'' ان آراء میں ایک کون سی غلط بات ہے جس پر معترض نے مورخ کا ہالکا کیا ہے۔ جس قسم کی ہندو مسلمان دوستی پر انہوں نے طنز کیا ہے بیسویں صدی کے بدترین حالات میں اس کا وجود تھا۔ گاندھی اور مولانا جوہر کی دوستی کہ اول الذکر ہمیشہ نئی دہلی آ کر محمد علی جوہر کے گھر میں ٹھہرا کرتے تھے وہ بیگم سے کہہ دیتے تھے کہ جب میرا دوست رہے گھر میں ماس مچھلی نہ پکائی جائے یہی نہیں بلکہ جب وہ گاندھی پر بگڑتے تھے تو ان کی ایسی تیسی بھی کر دیا کرتے تھے۔ گاندھی خاموشی سے ان کے غصے کو برداشت کرتے تھے اور کئی بار انہوں نے مولانا سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگی تھی اسی قسم کے گھریلو تعلقات اقبال اور پنڈت ہرکشن پرشاد کے

درمیان تھے۔ جس کی تفصیلات معترض اقبال و پرشاد کے خطوط سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جن کو مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور کے ایک رسالے "صحیفہ" نے شائع کیا ہے۔ اور بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں۔ نہرو سر جھکا کر مولانا ابوالکلام آزاد کی ڈانٹ سنتے تھے وغیرہ۔ صفدر صاحب کا اعتراض ہے کہ لیکن کیا وہ پس منظر تبدیل ہونے کے بعد ان رہنماؤں کی قوموں نے ان کی عظمت کو بھلا دیا؟ ڈاکٹر مبارک نے تو ایسا کوئی جملہ نہیں لکھا ہے اور جو کچھ انہوں نے رائے ظاہر کی ہے اس سے یہ بھی نہیں کی جاسکتی ہے کہ قوم ان کی عظمت کو بھلا دے۔ ان کا یہی کارنامہ کیا کم ہے کہ انہوں نے پاکستان کو خواب سے حقیقت میں بدل دیا۔ صفدر صاحب کو ان الزامات کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے جب 1947ء سے پہلے مولانا مودودی نے قائداعظم پر بہت سے الزامات لگائے تھے، معترض کو آگے بڑھنے سے پہلے اس سچائی سے آنکھیں چار کرنا چاہئے کہ قائداعظم کے ذہن میں جس جدید سیکولر جمہوری پاکستان بنانے کا منصوبہ تھا اور اقبال نے جس نظام معیشت کا خاکہ پیش کیا تھا۔ 1948ء کے بعد انہی دانشوروں اور مورخوں نے ان کو بے نام ونشان کر دیا جن کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے۔ رہا چرچل کی عظمت تو برطانوی قوم کے لئے وہ عظیم ہوسکتا ہے لیکن وہ کٹر قدامت پرست اور ہندوستانی قوم کو جاہل و پسماندہ سمجھنے والا لیڈر تھا اور ہندوستانیوں کو رسوا کرنے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ گاندھی کو وہ برملا "ہندوستانی ننگا فقیر" کہا کرتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے ایک حوالے کا ذکر کرتے ہوئے کہ "تھامس جیفرسن کا قول ہے کہ مردہ لوگوں کا زندوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے صفدر نے اس حوالے کو ان کے منہ میں ٹھونستے ہوئے لکھا ہے کہ "کیا امریکی قوم پر جیفرسن اور ابراہم لنکن جیسے رہنماؤں کے اقوال اور اصولوں کی حکمرانی اب ختم ہوگئی ہے؟ یہ سوال تو ان کو قبر توڑ کر پوچھنا چاہئے کہ اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ جہاں تک اقوال اور اصولوں کی حکمرانی کا سوال ہے تو یقیناً ڈک، چینی، بش اور رمسفیلڈ یا (CBR) کی امریکہ میں ان کی حکمرانی ختم ہوچکی ہے۔ کیا خوب

منطق ہے عالم و فاضل صفدر صاحب کی قائداعظم کہیں بھی پیدا ہوئے ہوں اور ان کا لقب جینا سے بدل کر جناح کر دیا ہو ان باتوں کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے ڈاکٹر مبارک علی کی کوئی رائے اقتباس نہیں کی ہے گویا یہ ان کی اپنی منطق ہے ورنہ جنم بھومی اور آباؤ اجداد کے نسلی تعلق کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ تو اعلیٰ پاکستانی مورخوں والی بات ہے کہ راہ ہموار ہو کر چت کر دیں کہیں اردو کو پٹ کر دیں۔ جینا کو جناح کرنے میں آخر کیا مفادات کارفرما تھے؟ اس کی وضاحت تو ہونا ہی چاہئے ورنہ وہ یہ بھی فتویٰ دیں گے کہ قائد کے عقائد پر تحقیق کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک اور بات جو کسی حوالے کے بغیر انہوں نے اپنی طرف سے چھیڑی ہے یہ ہے کہ ''تحریک پاکستان کے دور میں تخت برطانیہ، برطانوی وائسرائے، ہندو قوم، مہاتما گاندھی اور نہرو برصغیر کی تقسیم کے بغیر اس کی آزادی کے خواہاں تھے۔ مسلمانوں کی ترجمانی قائداعظم کر رہے تھے۔ جیت بالآخر عظیم رہنما کی ہوئی (یعنی قائد کی) پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ 1946ء کے اواخر میں اول الذکر سب نے برصغیر کے بٹوارے کو مان لیا تھا دوسری یہ ہے کہ 1939ء سے پہلے برطانوی سرکار ہندوستان کے بٹوارے کے حق میں نہیں تھی اور اسی لئے وائسرائے ویول کو رکھا گیا تھا۔ صفدر صاحب کو بھی پاکستانی مورخوں کی طرح یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ 1939ء میں حکمراں امریکی سامراج نے برطانیہ کی لیبر سرکار کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہندوستان کے بٹوآرے کا اعلان کیا جائے کیونکہ امریکہ کو اپنی اینٹی کمیونزم مہم کے لئے پسماندہ مسلمان قبائلی اور جاگیردار قوتوں کی ضرورت تھی اور ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ اس کے مقاصد اور مفادات کی تکمیل کے لئے نہایت موزوں تھا۔ برطانوی سرکار نے اس حکم کی تعمیل کی اور ویول کو ہٹا کر اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنایا تھا۔ (دیکھئے نامور برطانوی اسٹیفن ہاؤ کی کتاب کاؤنسل پالٹکس آف برٹین مطبوعہ بلیک ویل لندن 1994ء) مشکل تو یہ ہے کہ ایسی دستاویزی کتابوں کو ہمارے

دانشور اور مورخ صاف اڑا جاتے ہیں۔ کم سے کم اپنی عمر کے آخری زمانے میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس منعقدہ کراچی میں ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے یہ تو کہا کہ اگر قائداعظم نہ بھی ہوتے تو بھی پاکستان ضرور بنتا کیونکہ تاریخ کا دھارا اس کے حق میں تھا۔ بس دوسرے لفظوں میں یہی بات ڈاکٹر مبارک علی نے کہی ہے آخر میں صفدر صاحب لکھتے ہیں کہ ایک طرف ہندوستان والے ہیں جنہوں نے گاندھی کو مہاتما بنادیا۔ کیا تجاہل عارفانہ ہے! راشٹریہ سیوک سنگھ اور ان کا ہیرو سوار کر کھلے عام گاندھی کے دشمن تھے۔ سوار کر نے 1923ء میں کتاب ''ہندوتوا'' شائع کی تھی جس میں گاندھی کی ہندوستانی نیشنلزم کو رد کرتے ہوئے اس نے ہندو نیشنلزم کا نعرہ بلند کیا تھا پھر ناتھورام گوڈسے اور اس کے ٹولے کو اس نے گاندھی کے قتل پر اکسایا تھا۔ اس حوالے سے ان لوگوں کے مابین دو ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ موجودہ حکمراں بی جے پی بھی اس قتل کو جائز سمجھتی ہے اور اس کے نیتا برملا یہ کہتے ہیں کہ قوم کے باپو گاندھی نہیں سوار کر ہیں۔ گوڈسے کے بھائی نے ٹائم امریکہ کو دیئے گئے اپنے انٹرویو 2000ء میں اعتراف کیا ہے کہ گاندھی ہندو دشمن اور مسلمان و پاکستان کا حاشیہ بردار تھا سو ہم لوگوں نے اس سے پہلے کہ وہ پاکستان پہنچتا اس کا کام تمام کر دیا۔

تاریخ بڑا جان لیوا علم ہے اس کے لئے ایک سمندر کھنگھالے بغیر کچھ بھی کہہ لینا تاریخ کے ساتھ کھلواڑ نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے تنقیدی زاویہ نظر سے قائداعظم پر جو کچھ بھی لکھا ہے مگر نہ انہوں نے ان کی تضحیک کی ہے اور نہ یہ رائے دی ہے کہ قوم ان کی عظمت سے انکار کر دے۔ قوم کا قائداعظم کے بارے میں اب کیا رویہ ہے صفدر صاحب کو باہر نکل کر عام لوگوں میں لانا چاہئے اور ان کے خیالات معلوم کرنا چاہئے۔ بے چارہ عظیم قائد تو اب تن تنہا کراچی میں سو رہا ہے۔ نہ ہمارے صدر اور وزیر اعظم اسے خراج عقیدت پیش کرنے کراچی آتے ہیں اور نہ اسلام آباد اور لاہور یاترا کرنے والے بیرونی ملکوں کے سربراہ بانی پاکستان کے مزار پر پھولوں کے گلدستے رکھنے کے لئے کراچی میں

لائے جاتے ہیں۔امریکہ اور برطانیہ کے حکمرانوں نے تو خیر اپنے ہیروز کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرنے کی رسم جاری ہی نہیں کی۔صفدر صاحب کو انہیں مشورہ دینا چاہئے کہ وہ یہ رسم فوراً جاری کریں تا کہ ان کے دعوے کو کم سے کم جواز تو مہیا ہو جائے۔

روزنامہ جنگ لاہور 16-فروری 2004ء

جناح: ایک کھویا ہوا لیڈر

ڈاکٹر سید جعفر احمد/ترجمہ: رانا احمد داؤد

مورخین ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے کردار کے بارے میں شروع سے ہی اپنی اختلافی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ان میں سے کچھ تو، کسی قدر اختلاف کے ساتھ، برصغیر کی تقدیر کے تعین میں تاریخی قوتوں کی برتری واہمیت پر زور دیتے رہے ہیں جن میں جناح کا کردار محض تاریخی قوتوں کے بہاؤ میں آسانیاں پیدا کرنے والا تھا۔ جبکہ دوسرے مورخین کے نزدیک جناح خود ایک بنیادی تاریخی قوت کی حیثیت رکھتے تھے اور لیونارڈ موسلے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے پاکستان کو ایک آدمی کی تن تنہا کاوش کا ثمر قرار دیتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص گہرے معاشی وسیاسی عوامل یا انفرادی کاوش کے ان انتہا پسند نظریات سے متفق ہونے میں تذبذب محسوس کرے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ اور کسی قدر میکانکی انداز میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں باہمی تعامل وتعلق کو سمجھ سکتا ہے۔ کسی مخصوص تاریخی پس منظر سے پیدا شدہ موضوعاتی حالات اپنی مخصوص معروضی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ کسی مخصوص گروہ کی ضروریات کے مطابق رونما نہیں ہوتے اور نہ ہی افراد، چاہے وہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، ایک طویل عرصے سے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے حالات کو اپنی خواہشات کے مطابق کنٹرول کر سکتے ہیں۔ بہرحال ایک فرد کا کردار

ایسے حالات میں بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب وہ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق فوری عمل کرنے کے لئے ایک منفرد مقام پر کھڑا ہو۔یعنی لینن کے الفاظ میں جب زمانہ بیل گاڑی کی ست روی سے ایک اسٹیم انجن کی تیز رفتاری اختیار کر جائے۔

جناح کے معاملہ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ جب انہوں نے تقسیم سے پہلے کی دہائی کے دوران تیزی کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات کے پس منظر میں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ فوری مطابقت اختیار کی۔ اس کے علاوہ جو بات جناح کی شخصیت کو مزید نمایاں کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس وقت مسلم علیحدگی پسندوں کے پلیٹ فارم پر جناح کے بالمقابل کوئی اور جاذب نظر شخصیت موجود نہ تھی جو ان کی جگہ لے سکے۔ بیورلے نکولز نے اس حقیقت کا لب لباب یوں پیش کیا ہے کہ ''اگر گاندھی چلا جائے تو اس جگہ نہرو، راج گوپال اچاریہ، پٹیل یا درجنوں دوسرے ہندو لیڈر لے سکتے ہیں لیکن اگر جناح کو جانا پڑ جائے تو ان کی جگہ پر دوسرا کون آ سکتا ہے؟'' لہٰذا اگر پاکستان کی تخلیق کو جناح کی اتنی قریبی شناختی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے تو اس کا یہی پس منظر ہے جو انہیں ان کے ہم عصروں کے بالمقابل ایک بے مثال اور منفرد مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اور اسی حوالے سے سٹینلے ولپرٹ کا مقولہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ ''بہت کم لوگ تاریخ کا رخ نمایاں طور پر موڑ دیتے ہیں اس سے بھی کم لوگ دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور بہت ہی کم لوگ ایک قومی ریاست کی تشکیل کا کریڈٹ حاصل کرتے ہیں۔ جناح نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔''

مندرجہ بالا سیاق وسباق کے حوالے سے یہ ایک دلچسپ تناقض ہے کہ جناح' جنہیں پاکستان کی تخلیق میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے' کے نظریات سے پاکستان نے بہت ہی کم فائدہ حاصل کیا ہے۔ شاید کسی ملک نے بھی اپنے بانی لیڈر کی سیاسی بصیرت سے اتنی دوری اختیار نہیں کی جتنی پاکستان نے اپنے بانی سے کی ہے۔ جناح ایک تصوراتی فلسفی نہیں تھے جو اپنے پیچھے صرف سیاسیات یا معاشیات پر طویل مقالات چھوڑ گئے ہوں بلکہ وہ اس

ملک کے لئے، جوانہوں نے بڑی مشکلات کے بعد حاصل کیا تھا، عملی نظریات اور تصورات رکھتے تھے۔ان کا اپنے ملک کے بارے میں یہی تصور تھا جسے ان کی وفات کے بعد عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ بڑی باقاعدگی کے ساتھ انہیں خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے ان کا یوم پیدائش اور یوم وفات سرکاری اور قومی سطح پر بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔قومی عزت و وقار میں انہیں بہت اونچے مقام پر رکھا جاتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود پاکستان میں ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی یعنی سیاسیات اور معاشرت پر ان کے نظریات سے استفادہ حاصل کرنے کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا گیا۔

آزادی کے 56 سال گزرنے کے بعد قوم آج کہاں کھڑی ہے؟ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہے ملک میں قومیت کا بنیادی تصور ہی ناپید ہے۔قیام پاکستان کے ابتدائی ایام سے ہی پاکستانی معاشرے میں پڑنے والی دراڑوں کے پس منظر میں جانے کی بجائے اگر ہم اپنے آپ کو صرف موجودہ حالات سے متعلق زیادہ واضح سیاسی اور نظریاتی تقسیموں تک ہی محدود رکھیں تو بھی قومی یکجہتی کا فقدان ہی نظر آئے گا جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرے گا کہ اس قوم کے بانی نے ایک جدید اور مساوات پر مبنی قومیت کی تشکیل کے لئے کون سے قابل عمل راستے کی نشاندہی کی تھی۔ وہ ملک جسے سیاسی اور آئینی ذرائع سے حاصل کیا گیا تھا آج وہ پھر چوتھی مرتبہ ملک میں قائم ہونے والی فوجی حکومت کو عوامی حکومت بنانے کی ناکام تگ و دو میں مصروف نظر آتا ہے۔اس ملک کی تاریخ کا بیشتر حصہ آئین کے بغیر ہی گزرا ہے۔ ملک کا پہلا متفقہ اور قابل عمل آئین (گو کہ وہ بھی مکمل طور پر اپنی اندرونی کمزوریوں سے پاک نہیں ہے) ملک کے دولخت ہونے کے بعد ہی وجود میں آسکا۔ جس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ ملک کی لیڈرشپ کے لئے کسی ایک آئینی فارمولے پر متفق ہونا کتنا زیادہ مشکل کام تھا۔اور جب اتنی محنت اور اتنے بڑے ملکی المیے کے بعد ایک متفقہ آئین بنا تو اس کے بعد آنے والے سالوں میں مہم جو فوجی جرنیلوں نے آسانی کے ساتھ تڑ مڑ جانے والی

عدلیہ کی ملی بھگت سے اسے کئی بار معطل یا معرض التوا میں رکھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ساری صورتحال کو جناح کس نقطہ نظر سے دیکھتے؟ کیونکہ وہ تو ایسے شخص تھے کہ استعماری حکومت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے باوجود انہوں نے فوج کو حکومت کا ساتھ دینے کو کہا جس سے وہ وفاداری کا عہد کرتی ہے۔ فوج کے کردار کے بارے میں جناح کا نظریہ بڑا واضح اور صاف تھا۔ جب انہوں نے 14 جون 1948ء کو کوئٹہ میں فوجی افسروں اور جوانوں سے خطاب کیا تو اس میں فوج کے حلف وفاداری کا متن بھی دہرایا۔ انہوں نے فوج کو آئین کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کے مطالعہ سے انہیں یہ بات سمجھ آجائے گی کہ ان سے جب آئین کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد لیا جاتا ہے تو آئینی اور قانونی لحاظ سے اس کے کیا مضمرات ہوتے ہیں۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے کہ آئین سے وفاداری کے سلسلہ میں ان پر کیا قانونی واخلاقی فرض عائد ہو جاتا ہے۔ جناح کی اس تقریر کے ٹھیک تیس سال بعد جنرل ضیاء الحق کہہ رہا تھا ''آئین کیا چیز ہے؟ یہ صرف بارہ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز ہے جسے میں بڑی آسانی کے ساتھ پھاڑ کر پھینک سکتا ہوں۔''

جہاں تک ملک میں نظریاتی تقسیم کا تعلق ہے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج ملکی سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ مذہبی انتہا پسندی اور عدم رواداری کی صورت میں لاحق ہے۔ گذشتہ برسوں کے دوران سینکڑوں مذہبی گروہ اور جنگجو تنظیمیں ظہور میں آئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک صرف اپنے اسلامی اور جہادی نظریئے کو ہی درست مانتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان مختلف اسلامی گروہوں سے منسلک جنگجوؤں کو اصل اسلام کی وسیع النظری کا کم ہی علم ہے اور وہ دوسرے ممالک میں بندوق اور جبر کے زور پر اسلام پھیلانے کے حامی ہیں۔ یہ سارے جہادی گروہ پوری دنیا کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے لانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ بہرحال یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ سب گروہ صرف اپنی ذاتی خواہش کے تحت کام نہیں کرر ہے ان کے پس پشت بیرونی طاقتیں اور ملک کے اندر قائم طاقتور اسلامی

درسگاہیں ہیں۔ یہ انتہا پسند اسلامی گروہ نہ صرف دنیا میں دین اسلام کا اصل روپ بگاڑ رہے ہیں۔ بلکہ پاکستان کے اسلامی معاشرے کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ اسلام کی اپنی پیش کردہ من پسند تعبیر کو ہی اصل اسلام مانتا ہے اور دوسرے فرقوں کے بارے میں عدم برداشت کی تعلیم دیتا ہے جس کے نتیجے میں یہ گروہ نہ صرف سرحد پار افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ ملک کے اندر بھی ایک دوسرے کے خلاف دست و گریبان ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق پچھلی دو دہائیوں کے دوران تقریباً دو ہزار لوگ فرقہ وارانہ جھگڑوں اور مذہبی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ یہ مذہبی تنظیمیں دین اسلام سے لاعلم لوگوں میں مذہبی جوش و جنوں ابھار کر انہیں اپنے نام نہاد جہادی پروگرام میں شامل کرتی ہیں جن میں زیادہ تعداد غریب گھرانوں کے ایسے بے روزگار نوجوانوں کی ہوتی ہے جنہیں ریاست مناسب روزگار فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہے اور یوں غریب خاندانوں کی کفالت کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری سے غفلت برتتی ہے۔ اس مذہبی انتہا پسندی کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان جنگجو مذہبی تنظیموں کی آبیاری ریاست کے تحفظ کے لئے قائم کی گئی سیکورٹی ایجنسیاں کر رہی ہیں۔ یہ مذہبی انتہا پسند تنگ نظری اور تعصب کا نظریہ اپنائے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو دوسروں سے الگ سمجھتے ہیں وہ اپنی کم علمی اور عدم برداشت کی وجہ سے شائستہ گفتگو اور علمی دلائل کی رو سے کسی کو اپنا ہم خیال بنانے کی صلاحیت سے قاصر ہوتے ہیں اور مجبوراً اپنا نظریہ دوسروں پر ٹھونسنے کے لئے عقل کی بجائے بندوق کا سہارا لے کر بتدریج پورے معاشرے کو یرغمال بنا لیتے ہیں انہیں اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی کہ ایک ریاست کی تشکیل کے لئے کیا کیا سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور کون سی آئینی اقدار کو اپنانے سے ایک جمہوری معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ بالالفاظ دیگر آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ جدید قومی ریاست کی روح کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں جو اپنے سیاسی تشخص کے

لحاظ سے سب اداروں سے بالا ہوتی ہے لیکن اس کے اندر مختلف العقیدہ مذاہب یا ثقافتوں کو اپنی الگ شناخت قائم رکھنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

ریاست اور قومیت سے متعلق نظریات کے بارے میں اس انتہا پسند طبقے کی لاعلم منطق جناح کے علمی نظریہ سے یکسر مخالف ہے۔ جناح اس ضمن میں بڑی واضح سوچ رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا پورا علم تھا کہ قومیں کیسے وجود میں آتی ہیں اور کن حالات میں اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہیں۔ درحقیقت جناح جمہوریت اور قومیت کے باہمی تعلق کے اثرات کو بہتر طور پر سمجھنے والے اپنے وقت کے تمام مسلمان رہنماؤں میں سب سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ اپنی اس سوچ کو ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی حالات میں بڑے تخلیقی انداز میں روبہ عمل لائے۔ ریاست سازی۔۔۔ مثلاً قومیت اور جمہوریت۔۔۔ کے جدید نظریات کی ہندوستان کے مخصوص حوالے سے تخلیقی توضیح پیش کرتے وقت وہ یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ ایک ایسا ملک جہاں تہذیبی و ثقافتی خطوط پر مختلف سیاسی گروہ مستقل انداز میں اکثریت یا اقلیت بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہاں اقلیت کے مفادات کے تحفظ کی ہمیشہ ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ قومی ساخت و بناوٹ میں کوئی دراڑ یا شگاف پیدا نہ ہو سکے۔

ہندوستان میں مذہبی، ثقافتی اور سیاسی گروہوں میں مسلمان ہی ایک ایسا گروہ تھے جو تحفظات کے بغیر قائم ہونے والی نمائندہ حکومت کے قیام کی صورت میں ایک مستقل اقلیت کی شکل اختیار کر سکتے تھے۔ لہٰذا جناح ان کے مخصوص تحفظات کا کیس لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ کیس لڑنے میں انہوں نے مذہبی راستہ اختیار کرنے کی بجائے سیاسی راستہ اختیار کیا۔ جناح نے اپنی جدوجہد میں کبھی بھی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مذہب کے استعمال کو پسند نہیں کیا۔ تحریک خلافت میں حصہ نہ لینا ان کی اسی سوچ کا نتیجہ تھا۔ وہ تحریک خلافت کو ایک جھوٹا مذہبی ہیجان و اضطراب قرار دیتے تھے۔ لہٰذا اگر جناح نے مذہبی جوش و خروش کی سیاست کی طرف جانے کی بجائے

ہندوستان کی مسلم اقلیت کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا تو ان کے مذہبی جذبات کو نہیں ابھارا بلکہ صرف ان کی نمائندگی کی اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مذہب کا استعمال اور بات ہے اور ایک مذہبی اقلیت کے سیاسی مقاصد کا تحفظ کے لئے جدوجہد کرنا بالکل دوسری بات ہے۔اور جناح نے اسی دوسری بات کا انتخاب کیا۔انہوں نے ہندوستان میں بسنے والے دو بڑے مذہبی گروہوں (مسلمانوں اور ہندوؤں) میں باہمی رواداری، ہم آہنگی اور تعاون پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔لیکن جب وہ (دونوں طرف کے انتہا پسند عناصر کے ہاتھوں۔مترجم) اس میں ناکام رہے تو پھر ان کے لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ رہا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک جناح کا تعلق ہے تو ایک الگ مسلم ریاست کا قیام انہیں کوئی سونپا گیا فرض نہیں تھا اور نہ ہی ان کے لئے یہ کوئی اولین ترجیح تھی۔

پاکستان کی ریاست وجود میں آنے کے بعد جناح کو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کہیں پاکستانی قوم سے مذہب کے نام پر اکثریت اور اقلیت میں تقسیم ہونے کی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہو جائے لہٰذا اسی لئے انہوں نے پاکستانی قوم کے ڈھانچے کے اندر موجود تمام مذہبی گروہوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔آپ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن بہت ہی کم لوگوں نے اس تقریر کے اندر چھپے ہوئے جناح کے سیاسی فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔یہ تقریر کسی وقتی جذبے کے تحت نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی یہ صرف اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی لیکن اگر اس تقریر کا مکمل مطالعہ کیا جائے تو یہ جناح کے سیاسی نظریئے کی ایک بہترین تشریح ثابت ہوتی ہے۔جناح نے اپنی اس تقریر میں ایک نوساختہ ملک کے اندر ایک قوم کی تشکیل کے بارے میں اپنی حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے اس ضمن میں اپنا منشور بیان کیا ہے اور اپنا منشور بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ نے یہ بتایا کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی

تقسیم کے پس منظر میں اس کی بنیادی وجہ کیا تھی (یعنی ہندوستان کیوں تقسیم ہوا؟) اس تقسیم کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے دو اکثریتی اور اقلیتی گروہ اپنے پیچیدہ اور تیکھے مسائل و مطالبات کو سلجھا نہیں سکے اور ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے۔ ''واقعتاً اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو ہندوستان کے لئے آزادی اور خودمختاری حاصل کرنے کی راہ میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی ورنہ ہم بہت پہلے ایک آزاد قوم بن چکے ہوتے دنیا کی کوئی طاقت بھی کسی قوم کو اور خصوصاً چالیس کروڑ افراد پر مشتمل قوم کو اپنا غلام نہیں بنا سکتی تھی کوئی بھی آپ کو فتح نہیں کر سکتا تھا اور اگر کسی نے آپ کو اپنی غلامی میں لے ہی لیا تھا تو یہ غلامی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔'' ہندوستان میں اکثریتی اور اقلیتی گروہوں کے پیچیدہ اور تیکھے مسائل کے کردار پر بحث کرتے ہوئے آپ اس سے ایک بالکل مختلف اور مخالف صورتحال کا حوالہ دیتے ہیں جو برطانیہ میں رونما ہوئی جہاں ریاست نے عیسائیوں کے دو فرقوں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافی مسائل کو، ان کے درمیان امتیازی سلوک کو ختم کر کے اور انہیں ایک دوسرے کے برابر شہری حقوق دے کر، بڑی کامیابی کے ساتھ حل کر دیا تھا۔ جناح نے فرمایا ''آج آپ انصاف کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا وجود ختم ہو گیا ہے جس چیز کا وجود اب باقی ہے وہ یہی ہے کہ ہر آدمی برطانیہ کا شہری اور برابر کا شہری ہے اور سب برطانوی قوم کے افراد ہیں۔''

تمام شہریوں کے مساوی حقوق کو قومیت کی تشکیل کے لئے ناگزیر اور ایک بنیادی اصول گردانتے ہوئے جناح پاکستان کے لئے اپنا نصب العین پیش کرتے ہیں۔ ''میرے خیال میں اب ہمیں اپنے پیش نظر یہی مقصد رکھنا چاہئے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان، مسلمان نہیں رہے گا۔ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیونکہ یہ تو ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ ریاست کا شہری ہونے کے ناطے سیاسی لحاظ

ہے۔"

جناح کے یہ بیانات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ آپ پاکستانی ریاست کو اپنے شہریوں کے مختلف مذہبی عقائد کے لحاظ سے غیر جانبدار دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مذہب کو انسان کا ذاتی عقیدہ سمجھا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں برسراقتدار طبقے جناح کے سیاسی فلسفے کو نہیں سمجھ سکے اور نتیجتاً ریاست ایسے معاملات میں ملوث ہوتی گئی جس سے اس کا غیر جانبدارانہ کردار شکست وریخت کا شکار ہوتا گیا۔ تقریباً تمام جابروں، آمروں اور فوجی حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کو آئینی اور قانونی قرار دینے کے لئے مذہب اور مذہبی اجارہ داری پر انحصار کیا۔ اس سلسلے میں سیاسی قیادتوں نے بھی مذہب کے کارڈ کو برسر عام استعمال کیا۔ ملک کی تاریخ میں ایک لمبے عرصہ تک جداگانہ انتخاب قانون کی کتاب میں موجود رہا۔ 1973ء کا آئین وہ پہلا آئین تھا جس میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دینا ضروری سمجھا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں یہ بھی لکھا گیا کہ صرف مسلمان شہری ہی ملک کا صدر یا وزیر اعظم بن سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آئین ریاست کی غیر جانبداری اور شہریوں کے مساوی حقوق کے نظریئے کے سراسر خلاف ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شہریوں کے مساوی حقوق کو ہی اس آئین میں ایک شہری کا بنیادی حق قرار دے کر اس کا تحفظ بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح صدارت اور وزارت عظمٰی کے عہدوں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط عائد کرنا بھی ایک غیر ضروری امر ہے کیونکہ 97 فیصد مسلمان آبادی رکھنے والے ملک میں کسی غیر مسلم کا ان عہدوں پر فائز ہو جانا نہایت مشکل اور تقریباً ایک ناممکن بات ہے (اور اگر بالفرض محال کوئی غیر مسلم ان عہدوں پر فائز ہو بھی جاتا ہے تو وہ اپنی آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے ملک کی کثیر آبادی کے مفاد کو کس طرح نقصان پہنچا سکتا ہے؟ مترجم)۔ ریاست کے مقتدر طبقات اور اداروں کا سب سے قابل نفرت فعل یہ ہے کہ وہ نام نہاد قومی سلامتی اور خارجہ پالیسی کے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے

انتہا پسند مذہبی تنظیموں کی تشکیل و معاونت کرتے ہیں۔ اس وقت ملک کے اندر کالے بادلوں کی طرح منڈلاتی ہوئی مذہبی عدم رواداری کی فضا میں جناح کا وجود آج غیر مناسب اور بے مطلب سا ہو کر رہ گیا ہے لیکن اگر پاکستان نفرتوں اور جنون کی راکھ سے دوبارہ ظہور میں آنا چاہے تو جناح اپنے اصل مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔

روزنامہ ڈان 21-دسمبر 2003ء

بحث کا اختتامیہ

ڈاکٹر مبارک علی

تحریک پاکستان کی تاریخ کو ہمارے ہاں جس انداز سے لکھا گیا ہے، اس میں اولین طور پر شخصیت پرستی کو ابھارا گیا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور قائداعظم نے اس خواب کی تکمیل کر دی، تو ان دو جملوں میں پوری تاریخ کو سمیٹ لیا جاتا ہے اور تحریک کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ قائداعظم کی ذات کی وجہ سے پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ اب اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو جب قائداعظم نے یہ بات کہی کہ پاکستان انہوں نے اور ان کے ٹائپ رائٹر نے بنایا ہے، یہ منطقی طور پر صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی تشکیل میں عوام کی جدوجہد کے بجائے، مسلم لیگ، کانگریس اور حکومت برطانیہ کے درمیان گفت و شنید زیادہ اہم تھی، کیونکہ اس پورے سیاسی عمل میں ''ڈائی لاگس'' رہے ہیں اور مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم نے نمائندگی کی تھی۔

تحریک کے دوسرے عوامل پر زیادہ غور نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ دوسری بات جو کہی جاتی ہے وہ یہ کہ ہندو مسلمانوں کے دشمن تھے، اس لئے مسلمانوں کے لئے تحفظ کی خاطر ایک علیحدہ ملک بنانے کی ضرورت تھی۔ مگر کیا یہ علیحدہ ملک ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے بنایا جا رہا تھا یا صرف ان مسلمانوں کے لئے کہ وہ جن علاقوں میں اکثریت میں تھے؟

اکثریت میں ہونے کی وجہ سے انہیں ہندو اقلیت سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے جب سوالات اٹھے کہ ان مسلمانوں کا کیا ہوگا کہ جو دوسرے علاقوں میں اقلیت میں ہیں؟ کیا پاکستان بننے کے بعد وہ بے سہارا نہیں رہ جائیں گے؟ اس پر کچھ سیاستدانوں نے یہ تھیوری دی کہ ہندوستان میں مسلمان بطور اقلیت یرغمال ہوں گے اور پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ بھی یرغمالی کا سلوک کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ تقسیم کے بارے میں کسی کے ذہن میں واضح خیالات نہیں تھے۔ جناح صاحب کی خواہش تھی کہ وہ بمبئی میں واپس جا کر اپنے گھر میں رہیں گے۔ اس طرح انہوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ لوگوں پر آنے جانے کی پابندیاں نہ ہوں گی۔ یعنی اگر ملک تقسیم بھی ہو گیا تو روابط اسی طرح سے قائم رہیں گے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب نہیں ہوا اور دونوں ملکوں میں آپس کے تعلقات کے بجائے نفرتیں زیادہ بڑھیں۔

تحریک پاکستان کی تاریخ میں جس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ یہ کہ یہ جدوجہد ہندوؤں کے خلاف تھی اس ضمن میں پورے نوآبادیاتی دور اور انگریزی راج کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں لوگ برطانوی راج کو ایک نعمت سمجھتے ہیں کہ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان توازن قائم رکھ رکھا تھا۔

تاریخ نویسی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی ہے۔ نئے مواد کی روشنی میں حالات و واقعات کے بارے میں اور زیادہ معلومات ملتی رہتی ہیں، جن کی وجہ سے ماضی کے بارے میں نقطہء نظر میں تبدیلی آتی ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بارے میں بھی برطانوی سرکاری دستاویزات، نجی کاغذات، اور دوسرا مواد برابر سامنے آ رہا ہے، جس کی وجہ سے پوری تحریک کو نئے انداز سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے مورخ جو اس موضوع پر لکھ رہے ہیں، وہ حالات کو سیاہ وسفید کے بجائے ان کو وسیع تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے قائداعظم کو تقسیم کے سلسلہ میں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تھا، اب اس میں تبدیلی آئی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات

میں کچھ پاکستانی مورخوں نے بھی تقسیم کے بارے میں اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ مثلاً ایک بات اب یہ کہی جا رہی ہے، اور اس کی شہادتیں بھی ہیں کہ جناح صاحب پاکستان بنانے کے حق میں نہیں تھے، بلکہ وہ اسے بطور کارڈ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اس دباؤ کے تحت زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر سکیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے کینٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا۔ اس پلان کی منظوری کے پس منظر میں شاید ان کا یہ ذہن بھی کام کر رہا ہو کہ اس صورت میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا تحفظ بھی ہو سکے گا۔ لیکن کانگرس نے اس کو رد کر دیا، اور یوں متحدہ ہندوستان کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس کا منطقی نتیجہ پاکستان کے کچھ دانشور یہ نکالتے ہیں کہ دراصل تقسیم کی ذمہ دار کانگرس تھی۔

اسی ضمن میں پاکستان کے دانشوروں کے حلقہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے بنانے میں ہندو ذہنیت کارفرما تھی۔ یہ سردار پٹیل اور ہندو مہا سبھا تھی کہ جس نے پاکستان کو ایک حقیقت بنایا۔ اگر اس منطق کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان کے اصل بانی تو پٹیل، اور ہندو مہا سبھا کے راہنما ہوئے، مسلم لیگ اور اس کے لیڈر حضرات تو نہیں ہوئے۔ اگر پاکستان ہندو ذہنیت کی وجہ سے بنا تو پھر تحریک پاکستان کے حقیقی ارکان بھی یہی لوگ ہوئے، اور مسلم لیگ نے ان کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کو تقسیم کرایا۔

اس وقت راویتی مورخ جن مشکلات سے دوچار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ 56 سال کے گزرنے کے بعد، ملک جس سیاسی اتار چڑھاؤ سے گزرا ہے، اس میں حکمراں طبقے عوام کی خواہشات پورا کرنے میں ناکام رہے۔ اب اس ناکامی کو کس طرح سے تحفظ دیا جائے۔ لہٰذا اس کے لئے جن طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے، ایک تو مذہب کا استعمال ہے۔ جیسا کہ صفدر محمود صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ پاکستان تو مشیت ایزدی کے مطابق وجود میں آیا۔ یہاں ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے، مگر کیا یہ بھی مشیت ایزدی میں ہے کہ اس ملک پر نااہل اور بدعنوان حکومت کریں اور عوام محرومیوں کا

شکار رہیں؟

اس سلسلہ میں پاکستان میں بھی نظام مصطفیٰؐ کا نعرہ لگایا گیا، اور کبھی شریعت محمدیؐ کے نفاذ کے دعوی کئے گئے، مگر یہ سب عوام کے مسائل کو حل کرنے میں قطعی ناکام رہے۔ کبھی نظریہ پاکستان کے ذریعہ کوشش کی گئی کہ لوگوں کی تنقید کو روکا جائے۔ کبھی ''قومی مفادات'' کو استعمال کیا گیا۔ اسی عمل میں قائداعظم کی شخصیت کو نئے اسلامی ماڈل میں ڈھالا گیا اور کوششیں ہوئیں کہ انہیں مذہبی شخصیات کے طور پر پیش کیا جائے۔ لیکن جس شدت کے ساتھ یہ سرکاری نقطۂ نظر ذرائع ابلاغ اور نصاب کی کتابوں کے ذریعہ تشہیر کیا جارہا ہے اسی قدر اس کا ردعمل بھی ہے۔

اب لوگ دوقومی نظریہ کو بھی چیلنج کررہے ہیں، تقسیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں اور ان شخصیتوں پر بھی انگلی اٹھارہے ہیں کہ جو پورے عمل میں متحرک تھے۔ اب روایتی تاریخ اپنے اثر و رسوخ کو کھو بیٹھی ہے، اب اس کی جگہ جو نئی تاریخ لے رہی ہے اس میں زیادہ دلکشی اور جاذبیت ہے۔ لوگ تاریخ کو خوابوں اور کشف و کرامات کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہتے، وہ اسے ٹھوس حقائق اور شہادتوں کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں، وہ دلیل اور منطق کے ذریعہ واقعات کی تشریح چاہتے ہیں، اور ماضی میں جو کچھ ہوا ہے، اس سوال کا جواب چاہتے ہیں۔ وہ ان کھوٹے سکوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو کہ قائداعظم کی جیب میں تھے اور جنہوں نے اپنے کھوٹے ہونے کا آنے والے حالات میں ثبوت بھی دیا۔ مگر وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ آخر قائداعظم نے کیوں اصلی سکوں کو چھوڑ کر ان جعلی سکوں کو اپنی جیب میں رکھا؟

جب سوالات اٹھتے ہیں تو انہیں سنسر شپ، جبر، اتھارٹی، یا طاقت سے خاموش نہیں کرایا جاسکتا۔ یہ سوالات جوابات چاہتے ہیں، اور یہ جوابات تبدیلی کے خواہش مند ہیں، ایک ایسی تبدیلی کہ جس میں عوام متحرک ہوں اور اپنے مفادات کا تحفظ کرسکیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مستند کتب

تاریخ کی باتیں	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
پاکستانی معاشرہ	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
تاریخ کے نئے زاوئے	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
تاریخ کی آگہی	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
گمشدہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ اور آج کی دنیا	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ: تحقیق کے نئے رجحانات	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
سندھ کی تاریخ کیا ہے؟	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
تاریخ کی تلاش	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
انٹرویوز اور تاثرات	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
تاریخ اور تحقیق	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
تاریخ اور مورخ (ڈاکٹر کے ایم اشرف کی تحریریں)	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
جدید تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
یورپ کا عروج	ڈاکٹر مبارک علی	300/-

برطانوی راج (ایک تجزیہ)	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
دردر ٹھوکر کھائے (آپ بیتی)	ڈاکٹر مبارک علی	240/-
بدلتی ہوئی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
جاگیرداری	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
مغل دربار	ڈاکٹر مبارک علی	240/-
تاریخ اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
نجی زندگی کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ اور معاشرہ	ڈاکٹر مبارک علی	240/-
تاریخ اور دانشور	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
سندھ: خاموشی کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی	450/-
آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	240/-
برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
علماء اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
تاریخ اور عورت	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
تاریخ اور فلسفہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	450/-
تاریخ کی روشنی	ڈاکٹر مبارک علی	240/-
المیہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	450/-
اچھوت لوگوں کا ادب	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ کے بدلتے نظریات	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
غلامی اور نسل پرستی	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
تاریخ کیا کہتی ہے	ڈاکٹر مبارک علی	200/-

اکبر کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
جہانگیر کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
تاریخ اور مذہبی تحریکیں	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
ملحد کا اور کوٹ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
لطف اللہ کی آپ بیتی	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
شاہی محل	ڈاکٹر مبارک علی	400/-
تاریخ شناسی	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
تاریخ ٹھگ اور ڈاکو	ڈاکٹر مبارک علی	300/-
قائداعظم: کیا تھے کیا نہیں تھے	ڈاکٹر مبارک علی	200/-